آدابُ الطّالبین
مع
رفیقُ الطّلاّب و اَلباب ثلاثہ
تالیف
حضرت شیخ محمّد چشتی گجراتی قدّس سرّہٗ المتوفی ۱۰۴۰ھ
از اولاد مولانا کمال الدّین علاّمہؒ (خواہرزادہ حضرت چراغ دہلیؒ)
ترجمہ
ڈاکٹر محمّد بشیر حسین مرحوم
جمع و تدوین
ڈاکٹر محمّد اسلم رانا
پروگریسو بکس
۴۰۔بی اردو بازار، لاہور

آدابُ الطّالبین

مع

رفیقُ الطّلاّبُ و اَلبابِ ثلاثہ

تألیف

حضرت شیخ مُحمّد چشتی گجُراتی قدّسِ سرّہٗ المتوفیٰ ۱۰۴۰ھ

از اولاد مولانا کمال الدّین علاّمہؒ (خواہرزادہ حضرت چراغِ دہلیؒ)

ترجمہ

ڈاکٹر مُحمّد بشیر حُسین مرحُوم

جمع و تدوین

ڈاکٹر مُحمّد اسلم رانا

پروگریسو بکس

۴۰۔بی اردو بازار، لاہور

ناشر ـــــــــ پروگریسو بکس

مطبع ـــــــــ حامد اینڈ کمپنی
پرنٹرز پبلشرز لاہور

قیمت ـــــــــ ۲۱/- روپے

تاریخ اشاعت ـــــــــ ۱۹۸۴ء

مندرجات

چند کلمات

"آداب الطالبین" مع "رفیق الطلاب" اور "الباب ثلاثہ" فارسی زبان کے یہ تین صوفیانہ رسائل حضرت شیخ محمد چشتیؒ بن شیخ حسن محمد گجراتیؒ (کاٹھیاواڑ) کی عظیم مذہبی، علمی اور روحانی تصانیف ہیں۔ یہ رسائل تقریباً ایک صدی قبل ۱۳۱۱ھ میں دہلی سے شائع ہوئے تھے۔ لیکن آج کل نہ تو ان رسائل کے طبع شدہ نسخے کہیں سے دستیاب ہیں اور نہ ہی ان کے قلمی نسخے ملتے ہیں۔ سوائے "آداب الطالبین" کے ایک قلمی نسخے کے جو جامعہ پنجاب کی مرکزی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی میں موجود ہے روحانی اور مذہبی افادیت کے حوالے سے یہ ضروری تھا کہ ان رسائل کے اردو تراجم صاحبانِ علم و عرفان کی خدمت میں پیش کیے جائیں۔ چنانچہ مسندِ سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخشؒ) جامعہ پنجاب لاہور کے پروفیسر ڈاکٹر محمد بشیر حسین مرحوم جو نہ صرف فارسی زبان و ادب کے بلند پایۂ استاد، محقق اور ادیب تھے بلکہ عرفان و آگہی کے میدان میں حقیقت و طریقت کی وادیوں کے پرعزم مسافر بھی تھے۔ انہوں نے یہ فریضہ اپنی زندگی ہی میں ۱۹۸۲ء کے اوائل میں سرانجام دے دیا تھا۔ بوجوہ یہ رسائل طبع نہ ہو سکے اور اسی دوران جولائی ۱۹۸۳ء کو ڈاکٹر صاحب قبلہ اس دنیا کو چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی شخصیت میں ایک عجیب طرح کی کشش اور جاذبیت تھی۔ میری اُن سے ایک دو ملاقاتیں کاروبار کے ضمن میں ہوئیں۔ لیکن اُن کے اوصافِ حمیدہ اور صالح کردار نے میرے دل اور ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ انہیں اثرات کا

فیض ہے کہ میں ان رسائل کو چھاپنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ ان کے ایک رفیقِ کار جناب محمد اسلم رانا کی وساطت سے یہ ترجمہ شدہ رسائل ڈاکٹر صاحب مرحوم کے کاغذات سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے احوال و آثار اس کتاب کے آخر میں جناب اسلم رانا نے اپنے دلی جذبات سے تحریر کئے ہیں۔ وہ اپنی جگہ پہ ایک منفرد داستانِ جدوجہد اور افسانۂ رنج والم ہے۔ آغاز میں ان عظیم رسائل کے عظیم المرتبت مصنف کے حالاتِ زندگی کمال مہربانی سے اس عہد کے عظیم خطاط جناب سید نفیس الحسینی (نفیس رقم) نے تحریر فرمائے ہیں۔ کہ وہ خود اسی سلسلے سے نہ صرف تعلق رکھتے ہیں بلکہ اُسے آگے بڑھانے میں اپنے علم و عرفان سے فیض و برکات کے نئے سرچشمے جاری کئے ہوئے ہیں۔

میں یہ رسائل راہِ طریقت اور معرفت کے مسافران کی خدمت میں نہایت عقیدت سے پیش کر رہا ہوں۔ جس سے راہِ حق کے طالب و سالک بھی فیض حاصل کریں گے بلکہ عام مسلمان بھی نہایت ہی مفید مذہبی اور روحانی معلومات کا خزانہ حاصل کریں گے۔ یہ ترجمے ڈاکٹر صاحب مرحوم سے میری عقیدت کی نشانیاں بھی ہیں اور ان کی یادگاریں بھی۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ تینوں رسالے صاحبانِ علم و فضل کے فکری خزانوں میں نئے موتیوں کا اضافہ کریں گے۔

چوہدری غلام رسول

سید نفیس الحسینی

احوال و آثار

حضرت شیخ محمد چشتی گجراتی قدس سرہ (م ۱۰۴۰ھ)

آپ قطب الاقطاب حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی قدس سرہٗ (م ۷۵۷ھ) کے حقیقی بھانجے اور خلیفہ ارشد حضرت مولانا کمال الدین علامہؒ کی اولاد میں سے تھے۔

"آداب الطالبین" کے آغاز میں آپ نے اپنا نسب نامہ یوں تحریر فرمایا ہے:

"العبد الفقیر الی رحمۃ اللہ الصمد الشیخ محمد بن قطب الاولیاء، شیخ الاتقیاء شیخ محمد المعروف شیخ حسن محمد بن شیخ احمد المشہور بمیا نجیو بن شیخ نصیر الدین بن شیخ مجد الدین بن شیخ سراج الدین بن شیخ کمال الدین علامہ المستفیض ظاہراً و باطناً من خالہ الحقیقی الشیخ قطب الاقطاب بالحق والصواب شیخ نصیر الدین محمود الاودھی چراغ دہلوی ایدہ اللہ اللطیف بلطفہ الخفی والجلی"[1]۔ شیخ کمال الدین علامہ کا سلسلہ نسب امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔

حضرت شیخ محمد چشتی گجراتیؒ برصغیر پاک و ہند کے جلیل القدر چشتی مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ نے استفاضۂ باطنی اپنے والد بزرگوار حضرت شیخ حسن محمد چشتی سے کیا۔[2] شجرۂ طریقت حسب ذیل ہے:

---

[1] ۔ آداب الطالبین: ص ۱

[2] ۔ مناقب المحبوبین: ص ۹۷، انوار العارفین ص ۳۸۰

۱۔ قطب الاقطاب حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ	م ۷۵۷ھ
۲۔ حضرت شیخ کمال الدین علامہؒ	م ۷۵۶ھ
۳۔ حضرت شیخ سراج الدین گجراتیؒ	م ۷۶۲ھ بقولے ۷۷۰ھ
۴۔ حضرت شیخ علم الدین گجراتیؒ	م ۸۰۹ھ
۵۔ حضرت شیخ محمود راجن گجراتیؒ	م ۹۰۱ھ

۱۔ شیخ نصیر الدین محمود اودھی بن شیخ یحییٰ بن شیخ عبد اللطیف فاروقی لاہوری رحمہم اللہ تعالےٰ خلیفۂ اعظم و جانشین حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ (م ۷۲۵ھ) مزار مبارک دہلی میں مرجع خلائق ہے۔

۲۔ مولانا کمال الدین علامہؒ بن شیخ عبد الرحمٰن فاروقیؒ حضرت چراغ دہلیؒ کے حقیقی بھانجے اور خلیفہ تھے۔ "مناقب المحبوبین" میں لکھا ہے کہ آپ کو دادا پیر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سے بھی خلافت تھی۔ حضرت چراغ دہلیؒ کی حیات ہی میں ۲۷ ذیقعدہ کو وفات پائی۔ مزار مبارک حضرت چراغ دہلی قدس سرہٗ کے پائین میں ہے۔

۳۔ شیخ سراج الدین گجراتیؒ بن مولانا کمال الدین علامہؒ "القول المستحسن فی شرح فخر الحسن" میں لکھا ہے کہ آپ اپنے والدِ ماجد کے قائم مقام اور خلیفۂ اعظم تھے۔ نیز حضرت چراغ دہلیؒ سے بھی خلافت رکھتے تھے۔ ۱۲ جمادی الاولیٰ ۷۶۲ھ کو وفات پائی۔ مزارِ مبارک قلعۂ پیران پٹن نہروالہ محلہ برکات پورہ میں آپ کی خانقاہ کے صحن میں ہے۔

۴۔ شیخ علم الدینؒ بن شیخ سراج الدینؒ۔ والدِ ماجد کے مرید و خلیفہ تھے حضرت سید محمد گیسو دراز گلبرگوی قدس سرہ (م ۸۲۵ھ) خلیفۂ اعظم حضرت چراغ دہلیؒ کے بھی مسترشد و خلیفہ تھے ۲۶ صفر ۸۰۹ھ کو واصل بحق ہوئے۔ مزار مبارک پیران پٹن نہروالا محلہ برکات پورہ میں آپ کے والد ماجد شیخ سراج الدینؒ کے گنبد میں ہے۔

۵۔ شیخ محمود راجنؒ بن شیخ علم الدینؒ۔ اپنے والد ماجد کے مرید و خلیفہ تھے۔ آپ نے خاندانِ سہروردیہ اور شطاریہ کا خرقہ شیخ قادنؒ کے ہاتھوں پہنا۔ ایک خرقہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

۶۔ حضرت شیخ جمال الدین جمنؒ گجراتی شہید	م ۹۴۰ھ
۷۔ حضرت شیخ حسن محمدؒ گجراتی	م ۹۸۲ھ
حضرت شیخ محمد چشتیؒ گجراتی	م ۱۰۴۰ھ

خلافت چشتیہ سلسلہ کا شیخ ابوالفتح رکن الدینؒ گوالیری ثم کالپوی سے بھی حاصل کیا، جو حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز قدس سرہٗ کے مرید و خلیفہ تھے۔ اور ایک خرقۂ خلافت چشتیہ سلسلہ کا شیخ عزیز اللہ المتوکل علی اللہ بن شیخ یحییٰ بن شیخ لطیف الدین (خلیفہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ) سے بھی پہنا۔ شیخ عزیز اللہ شیخ زاہد چشتیؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ اور ایک خرقۂ خلافت انہوں نے اپنے پیر بھائی شیخ رکن الدین کانِ شکرؒ سے بھی پہنا تھا۔ حضرت شیخ محمود راجنؒ کو سلسلۂ مغربیہ کی خلافت حضرت شیخ احمد کھٹوؒ سے بھی حاصل تھی۔ آپ کا وصال ۲۲ صفر ۹۰۰ھ کو ہوا۔ مزار مبارک پیران پٹن میں ہے۔

۶۔ شیخ جمال الدین جمنؒ بن شیخ محمود راجنؒ: آپ اپنے والدِ ماجد کے مرید و خلیفہ تھے۔ نیز شیخ نصیر الدین ثانی بن شیخ مجد الدین بن شیخ سراج الدین بن شیخ کمال الدین علامہؒ سے بھی خلافت رکھتے تھے۔ نیز خاندانِ مغربیہ کی خلافت شیخ احمد کھٹوؒ سے بھی رکھتے تھے۔ آپ کی خانقاہ جانپانیر میں تھی۔ ایک رات کفار آئے اور آپ کو شہید کر دیا۔ ۲۰ ذی الحجہ ۹۴۰ھ کو احمد آباد میں وصال ہوا۔ مزار مبارک نور پورہ شاہ پور میں دریائے سانبھر کے کنارے پر ہے۔

۷۔ شیخ حسن محمدؒ بن شیخ احمد میانجیو بن نصیر الدین ثانی بن شیخ مجد الدین بن سراج الدین بن شیخ کمال الدین علامہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔ ۹۲۳ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ اپنے چچا شیخ جمال الدین جمنؒ کے مرید و خلیفہ تھے اور اپنے والدِ گرامی سے بھی خلافت رکھتے تھے۔ آپ کے والد اپنے آباؤ اجداد سے خلافت رکھتے تھے۔ مزید برآں حضرت شیخ محمد غیاث نور بخش بن محمد علی نور بخش نے آپ کو خاندانِ قادریہ میں بیعت کیا۔ اور تربیت فرمائی، یہاں تک کہ درجۂ کمال تک پہنچا دیا اور خرقۂ خاندان قادریہ، گازرونیہ، فردوسیہ، کبرویہ، نوربخشیہ اور ہمدانیہ عطا کیا۔ آپ کو شیخ بہاؤ الدین جو حکیم سہروردی کے نام سے مشہور ہیں سے بھی خلافت حاصل تھی۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

شیخ محمد چشتی رح

شیخ محمد چشتی رح ۹۵۶ھ میں احمد آباد گجرات (کاٹھیا واڑ) میں پیدا ہوئے[۱] علومِ عربیہ کی تعلیم اپنے والدِ ماجد سے پائی۔ عالمِ شباب میں تحصیلِ علم سے فارغ ہوئے اور تعلیم و تدریس اور مطالعہٴ کتب میں مصروف ہوئے۔ علامہٴ دہر و فہامہٴ عصر ہوئے۔ عارف باللہ اور عاشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ صاحبِ حضوری تھے۔ ریاضت و عبادت میں مشغول رہتے۔ صائم الدہر و قائم اللیل تھے۔ دریائے سانبھر متی کے کنارے سروپا برہنہ گھومتے اور ہر ہر قدم پر اللہ اللہ وردِ زبان رہتا۔"[۲]

مؤلف "تذکرہٴ اولیاء دکن" نے "مخبر الاولیاء" کے حوالے سے آپ کے شب و روز کے معمولات نقل کئے ہیں۔

"آپ صبح کی نماز کے بعد تلاوتِ قرآن اشراق تک کرتے تھے بعد ازاں گھر پر آتے۔ کھانا تناول کر کے قیلولہ فرماتے۔ قیلولہ سے برخاست ہو کر ظہر کی نماز ادا کر کے والدِ ماجد کے روضہ میں عصر تک تالیف و مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ عصر و مغرب کے مابین سلوک و تصوف میں درس فرماتے تھے اور مغرب کی نماز پڑھ کے عشاء تک وظائف اور عشاء کے بعد گھر پر آتے۔ کھانا تناول کر کے تہجد کی نماز تک وظیفہ و مطالعہ۔

بقیہ ص۔ آپ کا وصال ۲۸ ذیقعدہ ۱۰۴۰ھ کو ہوا۔ آپ کا مزار مبارک احمد آباد گجرات محلہ شاہ پور میں اپنے والد بزرگوار کے قریب ہے۔ آپ کے بیٹے شیخ محمد نے آپ کے ملفوظات "مجالس حسنیہ" کے نام سے مرتب کیے۔ آپ علوم ظاہری و باطنی کے عالم تھے اور صاحبِ تصنیف بھی۔ چنانچہ تفسیر محمدی، تقسیم الاوراد، رسالہ چہار برادران، حاشیہ تفسیر بیضاوی، حاشیہ قوت القلوب، حاشیہ شرح مطالعہ اور حاشیہ نزہتہ الارواح آپ کی تصانیف ہیں۔

(مناقب المحبوبین ص۱ تا ص۹) حدیقتہ الاسرار ص۹۴، ۹۵، ۹۶، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۱۲، ۱۱۳،

[۱]۔ انوار العارفین ص۳۸۰، تحفتہ الابرار ص۱۰۵، مناقب المحبوبین ص۸

[۲]۔ تذکرہٴ اولیاء دکن ص۹۱۹

تہجد ادا کر کے آرام فرماتے تھے۔“ [1]

والدِ ماجد نے ۲۸ ذیقعد ۹۸۲ھ کو رحلت فرمائی تو آپ نے خانقاہ اور سجادہ کو رونق دی۔ طالبین و مریدین کی ہدایت و تلقین میں مشغول ہوئے۔

آپ کے معاصر تذکرہ نگار محمد غوثی مؤلف "گلزارِ ابرار" آپ کے والد ماجد شیخ حسن محمدؒ کے ذکر کے تحت لکھتے ہیں:

”آپ کے بڑے بیٹے شیخ محمد جن میں زیادہ تر بزرگوار باپ کی خوبو پائی جاتی ہے۔ ان دنوں آپ کے جانشین ہیں۔“ [2]

گجرات کے مشہور بزرگ سید جلال [3] ماہِ عالمؒ کی خدمت میں بھی آپ حاضر ہوئے سید صاحب نے آپ کی عزت و آبرو کی اور فرمایا، آپ سے خلائق کو فائدہ پہنچے گا اور اور آپ کی ولایت کی بلاد و امصار میں شہرت ہوگی اور صاحبِ تصانیف ہوں گے۔ آپ کا قول و فعل صوفیۂ کرام کے نزدیک مقبول ہوگا۔ واقعی چند مدت کے بعد سید ماہِ عالم کے قول کی تصدیق ہوئی۔ آپ سے بے شمار خلائق مستفید ہوئی۔ [4]

توکّل و قناعت مشائخِ چشت کا طغرائے امتیاز رہا ہے۔ امراء و سلاطین سے انہوں نے کبھی کوئی غرض وابستہ نہ رکھی۔ حضرت شیخ محمد چشتی بھی اپنے مشائخ کے قدم بقدم تھے۔ آپ مُتوکّل علی اللہ و قانع برزق اللہ تھے۔ امراء و سلاطین سے کچھ تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ نفرت

---

[1] ۔ تذکرۂ اولیاء دکن ص ۹۱۹ [2] ۔ گلزارِ ابرار : ص ۳۲۱

[3] ۔ شاہ عالم بخاری گجراتیؒ کے نبائر سے ہیں۔ ۹۵۹ھ میں احمد آباد گجرات میں پیدا ہوئے حضرت سید شیر محمدؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ مولانا وجیہ الدین علوی گجراتی سے بھی حقائق و معارف [illegible] استفادہ کیا۔ عارفِ کامل و صوفیٔ واصل ہوئے اور حضرت شاہ عالمؒ کی خانقاہ و خاندان کو از سر نو زندہ کیا۔ ۱۴ ذیقعد ۱۰۳۰ھ کو وفات پائی۔ اپنے جدِ اعلیٰ کے روضہ میں پائین مرقد شریف موضع بٹوہ احمد آباد میں مدفون ہوئے۔ (تذکرہ اولیاء دکن ص ۲۴۴)

[4] ۔ تذکرۂ اولیاء دکن ص ۹۲۰

کرتے تھے۔ جب گجرات کی سلطنت منقرض ہوئی اور اکبر بادشاہ کے تصرّف میں آئی، تمام اہلِ معاش ومشائخ نے اسنادِ قدیمہ پیش کر کے اپنے حقوق بادشاہ سے لیے اور بادشاہ نے ہر ایک کو از سرِ نو بحالی کی سند عطا کی۔ آپ سے بھی مُریدین نے عرض کیا کہ اسنادِ قدیمہ پیش کیجئے اور جاگیرات ومعاش کو بحال کرا لیجیے۔ آپ نے فرمایا، ہم کو کیا حاجت ہے کہ مجازی بادشاہوں کا احسان ومنت اُٹھائیں۔ ہمارا بادشاہِ حقیقی رزاقِ مطلق ہے، بے منت ہم کو دیتا ہے اور دے گا۔ ہر چند کہ سب نے اصرار کیا، آپ نے انکار فرمایا اور اسنادِ قدیمہ کو خانقاہ کے حوض میں غرق کیا۔[1]

وفات

مُدّۃ العمر آپ نے ہدایت وارشاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایک عالم آپ کے فیوض و برکات سے سیراب ہُوا۔ آخر ۲۹ ربیع الاوّل ۱۰۴۰ھ کو چاشت کے وقت یہ آفتابِ ولایت غروب ہو گیا[2] اُس وقت عمر شریف ۸۴ سال تھی۔ احمد آباد گجرات میں اپنے والد ماجد کے مزار مبارک کے متّصل شرقی جانب میں مدفون ہوئے۔ ”واصلِ حق محمد چشتی“ (۱۰۴۰) سے کسی مخلص نے تاریخِ وفات نکالی۔

اولاد امجاد

آپ کے چار فرزند[3] تھے۔ جو علم وعمل اور صلاح وتقویٰ میں آپ کی یادگار تھے۔

---

[1] تذکرۂ اولیاء دکن ص ۹۲۰

[2] مناقب المحبوبین، ص ۸۰ (بحوالہ مخزن الاولیاء) تذکرہ اولیاء دکن میں تاریخ وفات ۱۹ ربیع الاوّل لکھی ہے۔ (ص ۹۲۲) انوار العارفین اور تحفۃ الابرار میں ۲۹ ربیع الاوّل ۱۰۴۱ھ مندرج ہے۔ (جدول ثانی ص ۱۰۸)

[3] مناقب المحبوبین ص ۸۱، تذکرہ اولیاء دکن ص ۹۲۳، انوار العارفین ص ۳۸۱

۱۔ شیخ حسن محمد چشتی ثانی : م غرہ ربیع الثانی ۱۰۴۰ھ

۲۔ شیخ محمود چشتی : مرید و خلیفہ والد ماجد۔ یہ تمام فرزندوں سے زیادہ آپ کو عزیز و محبوب تھے۔ آپ نے ان کے صاحبزادے یعنی اپنے پوتے شیخ یحییٰؒ کو سجادہ نشینی کا ولی عہد بنایا۔ شیخ محمود چشتی کی وفات ۹ ربیع الثانی ۱۰۴۰ھ کو ہوئی۔

۳۔ شیخ سراج الدین چشتی : المتوفیٰ ۱۰۵۰ھ

۴۔ شیخ عزیز اللہ چشتیؒ

خلفاء کرام

تذکرۂ اولیاء دکن میں حسب ذیل خلفاء کرام کے نام مندرج ہیں :

۱۔ شیخ یحییٰ قطب الدین (نبیرہ)
۲۔ شیخ حسن محمد (فرزند)
۳۔ شیخ محمود (فرزند)
۴۔ شیخ سراج الدین (فرزند)
۵۔ شیخ عزیز اللہ (فرزند)
۶۔ شیخ سراج الدین ثانی
۷۔ شیخ نصر اللہ المتوکل
۸۔ شیخ علی متقی خردؒ
۹۔ سید مصطفیٰ البخاری
۱۰۔ سید شریف بن سید عبد الرحمٰن علوی
۱۱۔ سید ابو محمد شیرازی
۱۲۔ شیخ فتح اللہ ہاشمی
۱۳۔ شیخ عطاء اللہ ہاشمی
۱۴۔ شیخ عیسیٰ چشتی
۱۵۔ حاجی علی بیجاپوری
۱۶۔ شاہ سراج غوثی
۱۷۔ مولانا فرید الدین
۱۸۔ شاہ لطیف علی درویش
۱۹۔ شیخ عظمت اللہ
۲۰۔ شاہ رکن عاجز
۲۱۔ شیخ سلیمان
۲۲۔ شیخ عبد الحی

لہ۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ (م ۱۱۴۲ھ) انہیں کے خلیفۂ اعظم تھے جن سے سلسلۂ چشتیہ کو بہت فروغ ہوا۔

۲۳۔ شیخ چاند ۲۴۔ مولانا اسحٰق بھروچی
۲۵۔ قاضی محمود بھروچی[۱]

تصانیف

حضرت شیخ محمد چشتیؒ علوم ظاہری و باطنی کا مجمع البحرین تھے۔ مخبر الاولیاء کے مولف میاں رشید گجراتی کا بیان ہے کہ آپ نمازِ ظہر کے بعد والدِ ماجد کے روضہ میں عصر تک تالیف و مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ مناقب المحبوبین میں ہے کہ آپ نے بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ مثلاً تفسیر حسینی اور چہل و دو نسخہ، جس میں بیالیس ابواب ہیں[۲]۔ "قصرِ عارفاں" میں حسب ذیل تصانیف کے نام لکھے ہیں[۳]۔

۱۔ آداب الطالبین ۲۔ رفیق الطلاب جاذب الیٰ رب الارباب
۳۔ الہامات رب العالمین بعد دار العین ۴۔ ہدایۃ المشائخ
۵۔ توضیح التوحید ۶۔ لباب ہدایت مختصر
۷۔ لذّاتِ مُنتہی

پیش نظر رسائل آداب الطالبین، رفیق الطلّاب اور الباب ثلاثہ اہل علم و عرفان کے لیے خضرِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۱۱ھ میں یہ پہلی مرتبہ شائع ہوئے تھے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس کے بعد سے اب تک دوبارہ ان کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ اللہ تعالےٰ نے ہمارے مخلص دوست جناب ڈاکٹر محمد بشیر حسین صاحب اُستاد شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی اورنیٹل کالج لاہور کو اس خزینۂ نادر کی طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے توفیقِ خداوندی سے اِن رسائل کا اردو میں نہایت عمدہ اور سلیس

---

[۱] تذکرۂ اولیاء دکن۔ ص ۹۲۴
[۲] مناقب المحبوبین ص ۸۱، تحفۃ الابرار ص ۱۰۸
[۳] قصرِ عارفان : ص ۲۰۶

ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب شریف النفس اور سلیم الفطرت انسان تھے۔ اُنہیں دین و مذہب سے گہرا لگاؤ تھا۔ وُہ مشہور عالم تبلیغی جماعت سے مُخلصانہ ذہنی و قلبی رابطہ رکھتے تھے تبلیغی سلسلے میں انہوں نے اندرونِ مُلک اور بیرونِ ملک متعدد سفر بھی کیے۔ اسی بناء پر انہیں تصوّف و سلوک سے بھی وابستگی و شیفتگی رہی۔ چنانچہ پیشِ نظر رسائل کا اُردو ترجمہ اُن کے اس جذبہ صادق پر دلالت کرتا ہے۔ آج جبکہ یہ رسائل ان کے ایک مُخلص رفیق جناب اسلم رانا کے اہتمام سے طبع ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ممدوح اس دُنیائے فانی سے عالمِ باقی کو رحلت فرما چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کے اِس عملِ صالح کو ذخیرۂ آخرت بنائے اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

مآخذ و مراجع

۱۔ آداب الطالبین : شیخ محمد چشتی گجراتی : مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۱ھ

۲۔ القول المستحسن فی فخر الحسن : مولانا احسن الزماں حیدر آبادی : مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۱۲ھ

۳۔ انوار العارفین : حافظ محمد حسین مراد آبادی : مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۶ھ

۴۔ تحفۃ الابرار : محمد نواب مرزا بیگ : مطبوعہ دہلی ۱۳۲۴ھ

۵۔ تذکرہ اولیاء دکن : مولانا عبدالجبار خاں ملکاپوری : مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۳۲ھ

۶۔ حدیقۃ الاسرار فی اخبار الابرار : صوفی امام بخش : مطبوعہ بعد ۱۳۲۲ھ

۷۔ قصرِ عارفاں : مولانا احمد علی : مطبوعہ اورنٹیل کالج میگزین لاہور ۱۹۶۶ء

۸۔ گلزارِ ابرار : محمد غوثی مانڈوی : مطبوعہ آگرہ ۱۳۲۶ھ

۹۔ مناقب المحبوبین : شیخ نجم الدین ناگوری : ترجمہ اُردو مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

حضرت شیخ محمد چشتی (م ۱۰۴۰ھ) بن شیخ حسن محمد احمد آبادی گجراتی (کاٹھیاواڑ) (م ۹۸۲ھ) کے تین صوفیانہ رسائل "آداب الطالبین" "رفیق الطلاب" اور "الباب ثلاثہ" کا اردو ترجمہ اہلِ علم و عرفان کی خدمت میں پیش ہے۔

یہ تینوں رسالے اگرچہ ۱۳۱۱ھ میں دہلی سے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کے قلمی نسخے بہت ہی کمیاب ہیں۔ "آداب الطالبین" کا صرف ایک قلمی نسخہ پنجاب

۱۔ خزینۃ الاصفیاء ۱: ۴۵۷

۲۔ تذکرہ علمای ہند (اردو) ص ۱۴۷ ۳۔ خزینۃ الاصفیاء ۱: ۴۳۶

یونیورسٹی کے ذخیرہ شیرانی[1] میں محفوظ ہے۔ "رفیق الطالب[2]" اور "الباب ثلاثہ" کا کوئی قلمی نسخہ مطبوعہ فہارس مخطوطات میں نہیں مل سکا۔

ان تینوں رسالوں کا مطالعہ نہ صرف ایک طالب اور سالک کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے بلکہ عامۃ المسلمین بھی ان سے بے حد مستفید ہو سکتے ہیں مثلاً آداب الطالبین میں زیادہ سے زیادہ تلاوتِ کلام پاک، ہر وقت باوضو رہنے کن اوقات میں نوافل نہیں پڑھے جاتے، اوّل وقت باجماعت نماز پڑھنے کی تاکید، وغیرہ ایسی باتیں ہیں جن پر عمل کرنے سے ہر مسلمان کو فائدہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض آداب اور سوچنے کا انداز ایسا ہے جس پر عمل کرنے سے ایک سالک کو مزید مقاماتِ عرفانی حاصل کرنے کے لیے بے حد مدد مل سکتی ہے بعض مقامات پر حضرت مصنف کے بیانات ایسے بصیرت افروز ہیں کہ ان پر عمل کرنے سے ایک سالک قربِ الہٰی کے مقام تک پہنچ سکتا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں کہ "وضو کرتے ہوئے ہر عضو کو دھوتے وقت اپنے وصل اور جدائی کا تصور کرے"[3]۔ یعنی جب وضو کا پانی میرے اعضا سے ملا رہتا ہے پاک ہوتا ہے لیکن جدا ہو کر ناپاک ہو جاتا ہے اسی طرح میں جب تک خدا تعالیٰ سے ملا رہتا ہوں پاک ہوتا ہوں، لیکن جدا ہو کر ناپاک ہو جاتا ہوں اور اللہ تعالےٰ سے ملے رہنے کا سب سے بہترین ذریعہ ذکرِ الہٰی ہے۔"

---

[1] :- فہرست مخطوطات: شیرانی، از نگارندہ، ۱۹۸۱

[2] :- مولوی رحمان علی صاحب نے اپنے تذکرہ میں اسی نام کے ایک رسالے کا ذکر کیا ہے جو شاہ ابوسعید عمری متوفی ۱۲۵۰ھ کی تصنیف ہے۔ (تذکرہ علمائے ہند اردو، ص۵)

[3] :- رک ص ۲۴۔

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "جو کوئی آج دنیا میں اپنا محاسبہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کل قیامت کے دن اس کا حساب آسان کر دے گا"[1] پھر آداب مراقبہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ مراقبہ میں ایسے محظوظ و مسرور ہو جیسے ماں کی گود میں بچہ۔[2] جو شخص اپنے شیخ کی راہنمائی میں، اپنے آپ کو ہر وقت اپنے خالق و رازق کی گود میں تصوّر کرنے لگے گا اور یہ سمجھنے لگے کہ جس طرح ماں بچے کے لیے سب سے زیادہ غمخوار ہوتی ہے اسی طرح اللہ تعالےٰ میرا سب سے بڑا چارہ ساز ہے تو وہ یقیناً سلک و سلوک منزلیں بڑی تیزی سے طے کر کے ایک مقام پر فائز ہو جائے گا۔ اسی طرح "رفیق الطلاب" میں جو تصوّف کی بحثیں آئی ہیں وہ اور بھی دقیق تر اور لطیف تر ہیں۔ مصنف نے آیاتِ مقدسہ اور احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں اپنے مرید کی ایسی راہنمائی کی ہے کہ جو ان کی نصائح پر خلوص سے عمل کرے گا کبھی گمراہ نہیں ہو گا۔

اگرچہ یہ تینوں رسالے مطبوعہ ہیں تاہم طباعت کی اغلاط سے مبرّا نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جگہ لکھا ہے "چند گام نگردد"[3] جو اصل میں "بگردد"۔ یا مثلاً لکھا ہے کہ "خالی دست بزدد"[4]، جو دراصل "خالی دست نرود" ہے۔ اسی طرح ایک جگہ لکھا ہے۔ "از حصہ خود بسیار بخورد"[5] حالانکہ یہ "نخورد" ہے۔

بعض مقامات پر مطبوعہ عبارتیں بڑی مبہم ہیں۔ مثلاً "پس پیش صاحب طعام عذر کند و عذر خود معلوم کند"[6] اسی طرح ایک جگہ آیا ہے "خطاباتِ حقیر

ا:- رک صہ ۲۵ | ۲:- رک صہ ۵۰

۳:- رک اصل صہ ۶ | ۴:- رک اصل صہ ۱۱

۵:- رک: اصل صہ ۱۳ | ۶:- رک اصل صہ ۱۲

بر خود عمل کند"۔ جو دراصل "خطاباتِ عظیم بر شیخ تصوّر کند و خطاباتِ حقیر بر خود حمل کند"۔

ہم نے ایسے تمام مقامات پر جہاں عبارتیں یا الفاظ غلط یا مبہم تھے، تصحیح کے بعد ترجمہ کیا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے حوالے ساتھ ہی قوسین میں درج ہیں اور احادیث کے حوالے حواشی میں دیے گئے ہیں۔ صوفیانہ اصطلاحات کی مختصر تعریف حواشی میں، حوالے کے ساتھ درج ہے۔ اگر قارئین کرام میں سے کوئی صاحب سہو و خطا سے مطلع فرمائیں تو یہ ان کا احسان ہوگا۔

محمد بشیر حسین

حضرت داتا گنج بخش پروفیسر فارسی
پنجاب یونیورسٹی، لاہور

مورخہ
۲۰ مارچ ۱۹۸۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آداب الطالبین

الحمد للہ رب العالمین علیٰ کل حال فی کل حین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد وآلہ اجمعین من النبیین والصدیقین والشہدار والصالحین۔ آمین۔ اس کے بعد یہ فقیر محمد بن قطب الاولیار شیخ الاتقیا شیخ محمد معروف بہ شیخ محمد ابن شیخ احمد جو میانجیو کے نام سے مشہور ہیں، بن شیخ نصیر الدین چراغ دہلی، بن شیخ کمال الدین، خدا انہیں اپنی پنہاں و عیاں مہربانیوں سے نوازے کہتا ہے کہ خدا انہیں دنیا و آخرت میں سعادت نصیب فرمائے جان لے کہ اس رسالے کا نام "آداب الطالبین" ہے۔ طالب کے لیے ضروری ہے کہ "احکام الصلوٰۃ[1]" یا "مقدم الصلوٰۃ (یا مقدمۃ الصلوٰۃ) یا "نام حق[2]" یا ان جیسی کوئی کتاب پڑھے تاکہ اُسے نماز، روزہ وغیرہ سے متعلق مسائل معلوم ہو سکیں، جن کا جاننا (ہر مسلمان کے لیے) ناگزیر ہے اگر ممکن ہو تو عربی کتاب "کنز الدقائق[3]" پڑھے، بصورت دیگر فارسی

---

[1] :۔ صفت ایمان وصلوٰۃ یہ یہ فقہی کتاب کسی گمنام مصنف نے آٹھویں صدی ہجری میں تالیف کی (فہرست مخطوطات شیرانی ص ۲۷)

[2] :۔ یہ تینوں نام ایک فقہی رسالے کے ہیں جو ۶۹۳ یا ۶۹۴ ھ میں لکھا گیا جس کے مصنف شرف الدین بخاری ہیں (فہرست شیرانی ص ۳۰۵، گنج بخش ۱/۱۸۴)

[3] :۔ فقہ حنفی پر یہ عربی رسالہ عبداللہ نسفی متوفی ۷۰۱ ھ کی تصنیف ہے (فہرست مخطوطات عربی از کرب ص ۱۴۹)

کتب کا مطالعہ ضرور کرے کہ جس کا بہت زیادہ فائدہ ہے۔ بالفرض اگر پوری پوری کتابیں پڑھنا اس کے لیے کسی وجہ سے مشکل ہو تو "عبادات" والے باب ضرور پڑھ لے۔ کیونکہ علم (رکھنا بہر حال) ایک بہت بڑی فضیلت ہے۔ "یرفع اللہ الذین اوتوا العلم درجات"[1] (مجادلہ ۵۸: ۱۱) کے مطابق جتنا زیادہ پڑھا جائے اور علم حاصل کیا جائے اچھا ہے۔ اگر کوئی طالب، معلم و مدرس ہو تو تعلیم و تدریس میں حتی الوسعی کوتاہی نہ کرے۔ اگر وہ معلم و مدرس نہ ہو تو کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ نہ کرے۔ سبق لینے کیلئے جانے میں بالکل سستی نہ کرے، سوائے اس کے کہ اس پر غلبۂ حال[2] ہو۔ اس صورت میں جتنا بھی ممکن ہو، کوئی حرج کی بات نہیں۔

علاوہ ازیں طالب کو چاہیئے کہ تلاوتِ قرآن پاک کی (زیادہ سے زیادہ) کوشش کرے۔ اگر تجوید و قرأت کے قواعد کے مطابق ذوق و شوق سے پڑھے تو بہت اچھا ہے اور جتنی مقدار آسانی سے تلاوت کو سکتا ہو کرے کیونکہ "فاقرؤا ما تیسر من القرآن"[3] (مزمل ۷۳: ۲۰) اور "لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا"[4] (بقرہ ۲: ۲۸۶) اور چاہیئے کہ "ورتل القرآن ترتیلا"[5] (مزمل ۳: ۴) کے مطابق ترتیل (قرآن پاک کو صاف اور صحیح پڑھنا) بھی

---

[1]:۔ اللہ علم والوں کے درجات بلند کرے گا۔

[2]:۔ نفسانی کیفیات میں سے جو پختہ ہو جائے، بلکہ اور جو نا پختہ ہو اُسے "حال" کہتے ہیں لیکن صوفیاء کے نزدیک جو تاثر سالک کے دل پر منجانب اللہ وارد ہو حال کہلاتا ہے جو وجد سے مشابہ ہوتا ہے۔ وجد میں اکثر خوشی کا غیر معمولی اظہار ہوتا ہے جبکہ حال میں غم اور درد وغیرہ کا غلبہ بھی ہو سکتا ہے۔ (استفادہ از فرہنگ علوم عقلی ص ۲۱)

[3]:۔ قرآن کریم میں سے جتنا آسانی سے پڑھ سکو پڑھو۔

[4]:۔ اللہ کسی کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔

[5]:۔ اور قرآن شریف کو کھول کھول کر پڑھ۔

12834

جانے یعنی جہاں تک اس کے بس میں ہو۔ ہر قسم کا ذکر کرتے وقت تلاوتِ کلامِ پاک کی بھی نیت کر لے۔

طالب کو چاہیئے کہ ہر وقت باوضو رہے اور جب کسی وجہ سے بے وضو ہو جائے تو اس کے بعد وضو کر لے اور وضو کا شکرانہ (دو رکعت تحیت الوضو) ادا کرنے میں تاخیر نہ کرے۔ "تحیت الوضو" ادا کرنے کے بعد سو بار "یالطیف" پڑھے، لیکن صبح صادق کے بعد، نمازِ عصر کے بعد، جب سورج سر پہ آ رہا ہو (دوپہر کو زوال کے وقت) سورج نکلتے اور غروب ہوتے وقت نہ پڑھے (تحیت الوضو)۔ ان کے علاوہ اوقات میں پڑھنا بہت افضل ہے۔ وضو کرنے میں بہت احتیاط برتے۔ دوسروں کی بہ نسبت، تھوڑا سا پانی زیادہ استعمال کرے تو حرج نہیں۔ اگر کوئی وضو کرانا چاہے اور وضو کرا دے تو منع نہ کرے، سوائے اس کے کہ وضو کرانے والا (کسی اعتبار سے) بزرگ ہو، اُس کو بڑے ادب اور تعظیم کے ساتھ منع کر دے۔ خود کسی سے وضو کرانے کی فرمائش نہ کرے۔ لیکن اگر ریاضت[1] یا معذوری و بیماری کی وجہ سے خود وضو کرنا مشکل ہو تو کسی دوسرے کو کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بھی کہ بغیر مسواک کے وضو نہ کرے اور تین بار آہستہ آہستہ مسواک کرے۔ ایسے کہ دانت کمزور نہ ہوں۔ اگر ہر بار (وضو کرتے وقت) مسواک کرنا مشکل ہو تو (دائیں) ہاتھ کی بڑی انگلی کو تین بار دائیں طرف کے دانتوں پر پھیرے اور انگوٹھی والی انگلی (انگوٹھے کی طرف چوتھی) کو بائیں جانب کے دانتوں پر تین بار پھیرے اور چوبیس گھنٹوں میں اچھی طرح مسواک کرے کہ منہ خوب

---

[1] :- لغت میں سرکش حیوان کو رام کرنے کے لیے آتا ہے۔ صوفیا کے نزدیک چونکہ نفسِ انسانی بھی ایک سرکش گھوڑے کی مانند ہے اس لیے اسے رام کرنے کے لیے بدن کو زیادہ سے زیادہ تکلیف دی جاتی ہے اس کی صورت یہ نکالی کہ ہر وقت نفس کے خلاف کیا جائے جس سے طالب کو ذہنی و بدنی رنج برداشت کرنا پڑتا ہے۔ (مستفاد از فرہنگ علوم عقلی، از جعفر سجادی، تہران ۱۹۶۲ء، ص ۲۸۳)

صاف ہوجائے اور دانت کمزور نہ ہوں۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو نمک اور کالی مرچ کو باریک پیس کر ملا لے اور دانتوں پر ملے تاکہ اچھی طرح صاف اور مضبوط ہوجائیں اور وضو کرتے وقت باتیں نہ کرے اور ہر عضو دھوتے وقت اپنے وصل اور جدائی کا تصور کرے۔ یعنی تصور کرلے کہ جب تک وضو کا پانی میرے اعضا سے جُدا ہوتا ہے تو ناپاک ہوجاتا ہے اور جب تک اعضا سے ملا رہتا ہے پاک ہوتا ہے۔ اسی طرح جب تک میں خُدائے تعالیٰ سے ملا رہتا ہوں پاک رہتا ہوں اور جب جُدا ہوجاتا ہوں تو ناپاک ہوجاتا ہوں۔ ذکر کرتے رہنے سے میں خدائے تعالےٰ سے ملا رہتا ہوں اور ذکر چھوڑ دینے سے جُدا ہوجاتا ہوں۔ پس مجھے چاہیئے کہ ہمیشہ ذکر میں رہوں۔ ورنہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوجاؤں گا۔ نیز یہ تصور کرلے کہ جیسے اعضا سے جُدا ہوکر پانی ناپاک ہوجاتا ہے اور زمین سے اُس کا ملاپ ہوجاتا ہے، اسی طرح خدائے تعالےٰ سے میرا ملاپ اُس کے ذکر سے ہے اور اس کا ذکر چھوڑ کر جدائی گویا میری موت ہے اور اپنے وجود پہ نظر دوڑائے کہ مجھے زمین کے ساتھ مل کر اس کی صفت اختیار کرنی چاہیئے یعنی جس طرح ہر چیز جو زمین سے باہر آتی ہے بالکل پاک صاف ہوتی ہے اِسی طرح مجھ سے بھی جو چیز باہر آئے وہ پاک صاف ہو اور وہ ذکر الہٰی ہے۔

رباعی:

"جب تک آدمی اپنے آپ کو پوری طرح فنا نہ کرلے، اس کے اثبات نفی[1]

---

[1]:۔ نفی اثبات ایک خاص ذکر ہے جس میں "لا" کے ذریعے ماسوا اللہ کی نفی اور "الا اللہ" کے ذریعے اللہ کا اقرار کیا جاتا ہے اس میں طالب آنکھیں بند کرکے سانس کو روکتا ہے اور "لا" کا لفظ ناف سے اٹھاتا ہوا داہنی طرف کندھے تک لاتا ہے۔ پھر سر کو دل کی طرف جھکاتے ہوئے دل پر "الا اللہ" کی ضرب لگاتا ہے۔ دل سے تمام وساوس کو نکال کر مخلوق کی نفی اور معبود کا اقرار کیا جاتا ہے۔

(مستفاد از کشف المحجوب (اردو) ص ۳۹۲، قول جمیل (اردو) از شاہ ولی اللہ، لاہور ۱۹۴۶ء، ص ۷۵-۷۷)

کے اقرار کو معتبر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اپنی انا کو چھوڑے گا تو اُس تک پہنچ سکے گا، ورنہ لاف و گذاف سے تو آدمی کو وصلِ محبوبِ حقیقی حاصل نہیں ہوتا" اور دھوکہ فریب کے جال سے نکلے بغیر یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا، بقول حافظ شیرازی:

اے حافظ چاہے تو شراب پی، رندی کر اور عیش و عشرت کر لیکن دوسروں کی طرح قرآن کریم کو لوگوں کے لیے دھوکہ فریب کا جال نہ بنا۔

اگر وضو کی دعائیں بھی پڑھے تو زیادہ اچھا ہے ورنہ ہر عضو کو دھوتے وقت کلمۂ شہادت ضرور پڑھے۔ اگر کسی وجہ سے وضو کرنا مشکل ہو تو تیمم کرے اور اگر تیمم بھی نہ کر سکتا ہو تو گویا معذور ہے اور اس کا عذر قبول ہوگا۔ بہر صورت پانچوں نمازوں کے وقت وضو کرے اگر نہ کر سکتا ہو تو تیمم کرے۔

طالب کو چاہیئے کہ ہر روز اپنا محاسبہ کرے۔ یوں آتا ہے کہ جو کوئی دنیا میں اپنا محاسبہ کرے گا، قیامت کے دن اس کا حساب آسان کر دیا جائے گا اور محاسبہ یہ ہے کہ جب (رات کو) سونا چاہے تو پہلے وضو کرے۔ پھر دو رکعت تحیۃ الوضو ادا کرے اور پھر لیٹے۔ اگر وضو ہو تو دوبارہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ چاہے کرے چاہے نہ کرے۔ اگر وضو کرنا مشکل ہو تو تیمم کرے اور اگر تیمم بھی نہ کر سکتا ہو تو کوئی حرج نہیں۔ لیٹنے کے بعد کسی سے بات نہ کرے۔ سوتے وقت پہلے قبلہ رو لیٹے اگر مشکل ہو تو کم از کم داہنی کروٹ ضرور لیٹے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو جیسے بھی لیٹ سکے۔ اس کے بعد، صبح بیدار ہونے سے لے کر رات کو سونے کے لیے لیٹنے تک کے سارے کاموں کو یاد کرے۔ جو کام شرع کے مطابق ہو اُس پر خوش ہو اور خلافِ شرع ہو اس پر توبہ کرے اور ایسی سچی توبہ کرے کہ پھر ہرگز اس کام کے قریب نہ پھٹکے۔ اگر دن میں ستر یا سو بار بھی گنہ کرے چاہیئے کہ ہر گنہ پر فوراً توبہ کرے۔ اگر کوئی دن میں پانچ بار اپنا یوں محاسبہ کرلے تو زہے نصیب۔ یعنی ہر نماز کے وقت پہلے اپنا محاسبہ کرلے اور پھر نماز پڑھے۔ ایسا

کرنے والا جلد ہی منزل مقصود کو پالے گا۔ جس کو توبہ (کی توفیق) مل گئی اُسے گویا دونوں جہانوں کی سعادتیں نصیب ہوگئیں۔

طالب کو چاہیئے کہ فرائض کو بڑے اہتمام کے ساتھ، اوّل وقت میں باجماعت ادا کرے۔ نمازِ فجر کو صبح صادق کے بعد ادا کرے۔ ظہر کی نماز کو سورج ڈھلے ادا کرے۔ عصر کی نماز کو اس وقت ادا کرے جب ہر چیز کا سایہ اپنے اصلی سایہ سے دوگنا ہو جائے۔ مغرب کی نماز غروبِ آفتاب کے وقت پڑھے اور عشار کی نماز، غروب کی سرخی کے بعد سفیدی غائب ہونے پر پڑھے اور ایک روایت کے مطابق غروب کی سرخی کے بعد بھی ہو سکتی ہے اور یہ تب ممکن ہے کہ وضو پہلے ہی سے کیا ہوا ہو۔ اگر یہ مشکل ہو تو نصفِ اول میں ادا کرلے۔ اگر یہ بھی مشکل ہو تو کم از کم مکروہ وقت میں نہ پڑھے اور ہمیشہ اس کا اہتمام رکھے۔ مقصد یہ ہے کہ نماز عصر کا وقت آجانے کے بعد کسی دوسرے کام میں مصروف نہ ہو سوائے تحیت الوضوکی دو رکعتوں کے۔ اگر تحیت الوضو نہ پڑھی ہوں تو سُنتیں پڑھے اور پھر نماز (عصر)۔ اگر جماعت نہ مل سکی ہو تو خودُ اذان اور اقامت کہہ کر اکیلا ہی نماز ادا کرلے تاکہ فرشتے اس کی اقتدا میں نماز ادا کریں۔ اس طرح جماعت کا ثواب مل جائے گا۔ (نمازوں کے بارے میں کوشش کی جائے) کہ اوّلِ وقت فوت نہ ہو۔ اِس خدشے کے پیشِ نظر کہ شاید موت جلد آجائے تو میں اس عمل کی حالت میں مروں گا اور ہمارا خاتمہ نماز پہ ہوگا اور مرنے کے بعد یہ شرمندگی تو نہ ہوگی کہ فلاں کی زندگی میں نماز کا وقت آیا اور وہ نماز ادا کیے بغیر دنیا سے چلا گیا، اگرچہ (نماز کا وقت ختم ہونے سے) پہلے مرنے والا گنہگار نہ ہوگا۔ اگر (اول وقت) پڑھنا مشکل ہو تو کم از کم مکروہ وقت نہ آنے دے۔ یعنی اگلی نماز سے تھوڑی سی دیر پہلے کا وقت عشائ کی نماز سے پہلے چار رکعتوں کی پوری کوشش کرے اور عصر سے پہلے کی چار رکعتوں کا تو ضروری اہتمام کرے۔ عشائ سے پہلے کی چار رکعتوں کا اس قدر اہتمام رکھے کہ لوگ سمجھیں

جیسے مؤکدہ سنتیں ادا کر رہا ہے۔ اگر کسی وقت جماعت کے نکل جانے کا ڈر ہو بے شک چھوڑ دے یا اگر کسی دوسری وجہ سے نہ پڑھ سکے تو فرضوں کے بعد ادا کر لینا افضل ہے۔ اگر چار رکعتیں پڑھنے کا وقت نہ ہو تو دو رکعتیں ہی پڑھ لے۔ فجر اور ظہر کی نمازوں میں "سبع طوال"[1] میں سے دو چھوٹی سورتیں قرأت کرے۔ عصر اور عشاء کی نمازوں میں "اوساط مفصل"[2] میں سے کوئی دو چھوٹی سورتیں پڑھے اور مغرب کی نمازیں "قصار مفصل"[3] میں سے دو چھوٹی سورتیں تلاوت کرے اور ہر نماز کے لیے کسی ایک ہی سورت کا تعین نہ کرے۔ لیکن اگر زیادہ سورتیں یاد نہ ہوں تو جو بھی یاد ہو پڑھ لے اگر کوئی امر مانع نہ ہو اور خود اچھا حافظ بھی ہو تو صبح اور ظہر کی نمازیں مذکورہ سورتوں میں سے لمبی قرأت کرے۔ اگر آغاز قرآن سے شروع کر کے "سبع طوال" کے آخر تک پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ خود امام نہ ہو۔ صرف اس وقت لمبی قرأت کرے کہ خود اکیلا پڑھ رہا ہو وہ بھی اس حد تک کہ مکروہ وقت نہ آجائے۔

عصر کی نماز میں چھوٹی قرأت کرے اور ایسے ہی باقی دوسری نمازوں میں قرأت اتنی مقدار میں ہو کہ مکروہ وقت نہ آجائے۔ مغرب کی نماز کے بعد تین بار دو دو رکعتیں (چھ رکعت) اوابین بھی پڑھے۔ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد تین بار سورہ اخلاص پڑھے۔ اس کے بعد ایک دو رکعت، حفاظتِ ایمان کی نیت سے پڑھے جس کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سات بار سورۂ اخلاص اور ایک ایک بار سورہ "الفلق" اور "والناس" پڑھے۔ سلام پھیرنے کے بعد سر سجدہ میں رکھ کر تین بار "یا حیّ یا قیوم ثبّتنی علی الایمان"[4] کہے۔ ان نوافل کو کبھی نہ

---

[1] :۔ یعنی بقرہ، آل عمران، النساء، مائدہ، انعام، اعراف اور انفال و توبہ

[2] :۔ یعنی گیارہ سورتیں مئین کی اور بیس سورتیں مثانی کی۔ یعنی سورہ یونس سے لے کر سورہ مومن تک

[3] :۔ سورہ حٰم سجدہ سے آخر تک، [4] :۔ اے ہمیشہ زندہ رہنے والے اور ہمیشہ قائم رہنے والے مجھے ایمان پر قائم رکھ

چھوڑے، اگر کبھی رہ جائیں تو ان کی قضا پڑھ لینا افضل ہے۔ اسی طرح وتروں سے پہلے دو رکعتیں ادا کرے، ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد دس بار سورہ اخلاص پڑھے اور سلام پھیرنے کے بعد ستر بار "یا وھاب" کہے۔ ان نوافل کو بھی کبھی نہ چھوڑے اگر کبھی رہ جائیں تو ان کی قضا پڑھ لینا افضل ہے۔ تہجد کی نماز کا عزم بالجزم کرے۔ اگر کبھی رہ جائے تو اس کی قضا پڑھنے کا بھی بہت ہی فائدہ ہے۔ اگر ہو سکے تو "اشراق" اور "چاشت" کے نوافل بھی پڑھے۔ اسی طرح دن کا چوتھا حصہ گذرنے پر اور زوال کے وقت کے قریب مکروہ وقت سے پہلے چار رکعت پڑھے یا ان دو میں سے کسی ایک وقت کی چار رکعتوں پر بھی اکتفا کر سکتا ہے۔ نماز ضحیٰ (چاشت) ادا کرنے کی بھی کوشش کرے جس میں چار رکعت نفل پڑھے جاتے ہیں تاکہ تنگدستی اور پریشانی سے محفوظ رہے۔ اگر ہو سکے تو ظہر، مغرب اور عشاء کے (آخر میں) نوافل کو باقاعدگی سے پڑھے، جتنے بھی آسانی سے پڑھ سکتا ہو۔ کسی نفل نماز کو بھی دل پر بوجھ نہ جانے۔ فرض نمازوں سے فارغ ہو کر دس بار درود شریف اور دس بار سورہ اخلاص پڑھے بلکہ مؤکدہ سنتوں کے بعد بھی پڑھ لے اور کسی حال میں ناغہ نہ آنے دے۔ اگر بالفرض کسی وقت نہ پڑھ سکے تو اس کی قضا پڑھے تو بہت اجر و ثواب کا باعث ہوگی۔ ہر نماز کے وقت سمجھے کہ وہ خدائے تعالےٰ کو دیکھ رہا ہے۔ اگر دل میں کوئی وسوسہ ہو کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کی ذات تو بے مثال اور بالاتر از ہر وہم و خیال ہے: بیت

"دنیا میں ہر چیز کی مثال موجود ہے لیکن صرف اس کی ذات ایسی ہے جو یکتا ہے اور جس کی کوئی مثال نہیں" لہذا یہ یقین کرے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ نماز دل کی حضوری سے پڑھے کیونکہ خدائے تعالےٰ دلوں کی باتیں جانتے ہیں اور دلوں کے اندر تک دیکھتے ہیں۔ پس ہر حالت میں کوشش کرے یاد خدا کے علاوہ کوئی اور چیز یا خیال اس کے دل میں نہ آئے۔

طالب کو چاہیئے کہ پیشاب، پاخانہ کرتے وقت ملاپ وجدائی کا تصور کرے۔ جب پیشاب پاخانہ کرنے جائے تو بایاں پاؤں پہلے رکھے پھر دایاں اور باہر آتے وقت اس کے اُلٹ۔ اِن دونوں وقتوں میں آدمی کا چہرہ یا پیٹھ قبلہ کی طرف نہ ہو۔ سوائے اس کے کہ دیوار یا کوئی دوسری آڑ ہو۔ لیکن ایسی صورت میں بھی نہ ہو تو افضل ہے۔ جس وقت بھی پیشاب کی حاجت ہو جلد (بیت الخلاء) جانا چاہیئے۔ پیشاب پاخانہ سے فارغ ہو کر وہاں زیادہ دیر بیٹھا نہ رہے۔ جب پاخانہ سے فارغ ہو تو کچی مٹی کے تین ڈھیلے لے کر ان سے استنجا کرے۔ پہلا ڈھیلا بائیں ہاتھ میں لے کر آگے سے پیچھے کو پھیرے اور دوسرے دو کو پیچھے سے آگے کو۔ اس کے بعد لوٹا ہاتھ میں لے کر طہارت کرے۔ اگر پاس ہی زمین پاک ہو تو اس پر ہاتھ مار کر ہاتھ کو مٹی سے دھوئے تو افضل ہے۔ دائیں ہاتھ سے پانی ڈالے اور بائیں ہاتھ سے دھوئے۔ اگر پاخانہ نرم ہو تو پانی سے دھویا جائے۔ ورنہ تین کونوں والے ڈھیلے سے استنجا کیا جائے تو جائز ہے۔ اگر تین سے زیادہ ڈھیلے استعمال کرنے کی ضرورت پڑے تو پانچ بلکہ سات استعمال کرنے میں بھی حرج نہیں۔ جب پیشاب سے فارغ ہو تو نالی کو شروع سے لے کر سپاری تک آہستہ آہستہ دبا کر نچوڑے۔ پھر سپاری کو پکڑ کر آہستہ آہستہ تین بار ملے اور پھر تین بار کھانسے۔ فارغ ہونے پر سپاری کو بائیں ہاتھ میں لے کر دائیں ہاتھ سے پانی ڈال کر دھوئے۔ اگر ضرورت ہو تو اور دیکھے کہ پاک نہیں ہوا (آلہٴ تناسل) تو خشک مٹی کا پاک ڈھیلا لے کر پیشاب والے سوراخ پر رکھے اور چالیس قدم یا زیادہ اِدھر اُدھر چلے اور اگر قطرہ آئے تو اس ڈھیلے سے خشک کرے پیشاب سے پاک رہنے کی حد درجہ کوشش کرے۔ اگر پیشاب کے قطروں سے احتیاط نہ کی جائے تو شیطان وسوسے ڈالتا ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ آلہٴ تناسل پستان کی طرح ہوتا ہے۔

جب دینی امور کے بارے میں کوئی چیز لکھے تو اسے اپنے نزدیک ڈھانپ کر رکھے

اگر انگوٹھی پر کوئی دینی چیز لکھی ہو تو (بیت الخلاء) جاتے وقت اُسے اتار لے یا کسی چیز سے ڈھانپ لے۔

جب رفع حاجت یعنی پاخانہ کرنے بیٹھے تو اپنا بوجھ قدرے بائیں پاؤں پر رکھے اور دائیں پاؤں کی ایڑی قدرے اونچی کرے۔ چاہیئے کہ سورج اور چاند کی روشنی میں پیشاب پاخانہ نہ کرے بلکہ اوٹ میں بیٹھے، سوائے اس کے کہ اس کی ضرورت ہو۔ پیشاب کرتے وقت ہوا کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھے اور کسی نرم جگہ پیشاب کرے۔ اگر پاک اور خشک ڈھیلا نہ ملے تو کسی کپڑے سے صاف کر لے۔ پیشاب پاخانہ کرتے وقت کوئی بات نہ کرے اور غسل کرتے وقت اگر پانی جاری ہو جائے تو وہاں پیشاب کرتے میں کوئی حرج نہیں۔ جہاں بیٹھ کر پاخانہ کر رہا ہو وہیں طہارت نہ کرے۔ اگر کسی اونچی جگہ بیٹھا ہو، جہاں پانی نہ چڑھ سکتا ہو تو وہیں (اپنے آپ کو) دھویا جا سکتا ہے۔ پیشاب کرتے وقت ایک پاؤں پر بیٹھے۔ جیسے رفع حاجت کے وقت دائیں پاؤں کی ایڑی قدرے اونچی کر کے، بوجھ اپنے بائیں پاؤں پر کرے۔ پیشاب پاخانہ کرتے وقت اپنی پردے کی جگہوں کو نہ دیکھے، سوائے اس کے کہ ضرورت ہو۔

طالب کو چاہیئے کہ سورج نکلنے سے لے کر عصر تک جب بھی فرصت ملے تھوڑا سا آرام بھی کر لے۔ اگر نیند نہ آ رہی ہو تو ویسے ہی لیٹا رہے تا کہ رات کو جاگنے خصوصاً تہجد کے لیے اٹھنے کی طاقت مل سکے (اس نیت سے) اگر باقاعدگی سے قیلولہ[۱] کرتا رہے تو یہ بہت بڑی سعادت ہوگی۔

طالب کو جاننا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ نے دن رات میں ایک ایسی گھڑی مقرر کر رکھی ہے کہ اس وقت دعا بالکل رد نہیں ہوتی۔ یعنی خدائے تعالیٰ "لبیک عبدی"[۲]

---

[۱] :- دوپہر کے کھانے بعد تھوڑا سا آرام کرنا، جو سنتِ رسول صلعم ہے۔

[۲] :- یعنی اے میرے بندے میں حاضر ہوں۔

کہہ کر اسے قبول فرماتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ وہ مراد جس کے لیے دعا کی ہے اسی وقت پوری ہو جائے۔ اگرچہ وہ دعا قبول ضرور ہو گی خواہ اس دنیا میں خواہ اگلے جہان، جیسے بھی اس کے لیے بہتر ہو گا۔ لہذا چاہیئے کہ اکثر عبادت میں مشغول رہا جائے۔ بعض کے نزدیک دعا کی قبولیت کا وقت صبح ہونے سے پہلے کا ہے، بعض کہتے ہیں کہ وہ وقت صبح صادق کا ہے بعض کے خیال میں سنت اور فرائض کے درمیان کا وقت ہے۔ بعض کے مطابق نماز فجر کے فرائض کے بعد سورج نکلنے تک کا وقت ہے۔ بعض کے نزدیک چاشت، بعض کے نزدیک زوال کے وقت، بعض کے نزدیک عصر کا وقت۔ بعض کے نزدیک عصر سے مغرب تک کا وقت، بعض کے نزدیک نماز مغرب کے بعد سے عشاء تک کا وقت، بعض کے نزدیک آدھی رات کا وقت، بعض کے نزدیک تہجد کا وقت دعا کی قبولیت کا وقت ہے۔ یہ اختلاف بھی رحمت ہے۔ کیونکہ اس کے باعث طالب کو چاہیئے کہ کسی وقت بھی (کسی نہ کسی) عبادت سے غافل نہ رہے تاکہ قبولیتِ دعا کی گھڑی اُسے میسّر آجائے، کیونکہ وہ گھڑی معین تو نہیں ہے۔ لہٰذا طالب کا کام تو ہر روز بس ذکر و عبادت کرنا ہے۔ خصوصاً ان اوقات میں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ طالب کو چاہیئے کہ ایسے وقت کو پانے کی کوشش میں لگا رہے کیونکہ وقت شب قدر کی مانند ہوتا ہے۔ مذکورہ طریقے سے سونا بھی عبادت ہے۔ اگرچہ وہ سو رہا لیکن (حضور صلعم کا) یہ طریقہ اختیار کرنا بھی عجیب تاثیر رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سونے کی برکت سے اُسے (قبولیت کی) وہ گھڑی مل جائے۔ جو کوئی چند بار ایسی گھڑی کو پا لیتا ہے اس کے لیے تو ایسے سارے اوقات برابر ہو جاتے ہیں۔ چاہیئے کہ کسی بھی عبادت کو مکروہ اوقات میں ادا نہ کرے۔ جن اوقات میں نماز مکروہ ہو، اس وقت مراقبہ[۱] یا تلاوت یا ذکر و تسبیح میں مشغول ہو جائے۔ مراقبہ

---

[۱] وکان اللہ علیٰ کل شیءٍ رقیبا (احزاب ۳۳: ۵۲) جیسی آیات مقدسہ سے الہام لے کر صوفیائے کرام نے اپنے دل کی نگرانی اور حفاظت کا ایک طریقہ وضع کیا ہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

بہت زیادہ کرے۔ کیونکہ اس کی تاثیر کو وہی جانتا ہے جو مراقبہ کرتا ہے۔ اگر اپنے پیر و مرشد کا مراقبہ کرے بلکہ تلاوت قرآن اور دوسری عبادات سے متصل مراقبہ کرے اور اپنے پیر و مرشد کو حاضر و ناظر جانے یا وہ مراقبہ کرے جس کا اس کے پیر و مرشد نے حکم کیا ہو تو اس کو زیادہ فیض حاصل ہوگا اور وہ جلد اپنی مراد کو پائے گا۔ انشاء اللہ۔

ہم کہتے ہیں کہ شیخ کے نام مبارک کا مراقبہ اس نیت سے کرے کہ اُسے زیادہ فائدہ ہو۔ شیخ کے نام کا مراقبہ کرنے کے بجائے (اُس وظیفہ کا) جس کا شیخ نے حکم کیا ہو مراقبہ کیا جائے تو زیادہ صحیح ہے۔ پس شیخ کے نام کا مراقبہ چھوڑ کر شیخ کا بتایا ہوا مراقبہ کرے اگر وہ مراقبہ کیا جائے جو طالب کے شیخ کا معمول اور اسے زیادہ مرغوب ہو تو بے حد فائدہ دیکھے گا جو بیان سے باہر ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ شیوخ میں سے مجھے فلاں شیخ سے فیض حاصل ہو جائے، خواہ ارادت کی وجہ سے، خواہ اجازت کی بناء پر یا فرمان کی رو سے، ان کے نام کا مراقبہ کرے اور نماز سے فارغ ہو کر دس بار یا شیخ فلاں کہے اور دس بار یا مولانا فلاں کہے تو بے حد فائدہ ہوگا۔ مراقبے کے دوران اُسے حاضر و ناظر جانے تو چند ہی روز میں اس کا فائدہ محسوس ہونے لگے گا۔

طالب کو چاہیئے کہ مغرب کی نماز کے بعد سے لے کر سورج نکلنے تک کوئی غیر ضروری بات نہ کرے خواہ آسان ہو یا مشکل۔ عشاء کی نماز کے بعد یا وتروں کے بعد اور اگر حرج نہ ہو تو

طالب آنکھیں بند کر کے گردن جھکا کے دل میں تصور کرے کہ اللہ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ ہر دنیاوی خیال اور اشیاء کو دل سے نکال کر اللہ، کہے۔ تھوڑی دیر کے لیے روزانہ یوں مشق کرنے سے آہستہ آہستہ یہ بات نصیب ہوگی کہ ہر وقت اللہ کو حاضر و ناظر جاننے لگے گا اور اپنے دل کی نگرانی کرے گا کہ اس میں کوئی وسوسہ پیدا نہ ہو۔ مراقبے کئی قسم کے ہیں اور ہر ایک میں مختلف کلمات پڑھے جاتے ہیں تاکہ آدمی اپنی ہستی کو بھول کر خدا کی ذات میں محویت پیدا کر سکے۔

(مستفاد از قول جمیل صد ۷۵ وضیاء القلوب صد ۲۳) از مولانا امداد اللہ مکی۔

نمازِ عصر کے بعد سے سورج غروب ہوتے تک یعنی ''اصفرارِ شمس [1]'' تک مطالعۂ حدیث و تفسیر یا سلوک [2] و حقائق [3] میں مشغول رہے۔ البتہ حقائق میں تھوڑا وقت صرف کرے کیونکہ طالب روزے سے ہوتا ہے۔ کھانا عشار کی نماز کے بعد کھائے اور اگر حرج نہ ہو تو دن میں دانتوں پر نمک نہ ملے بلکہ رات کو ملے تو افضل ہے۔ اگر سوکھی روٹی کے ٹکڑے سے روزے کھولے تو افضل ہے اور اکثر روزہ رکھنے کی کوشش کرے۔ اگر (کسی وجہ سے) ممکن نہ ہو تو معنوی روزہ ضرور رکھے۔ یعنی کم کھائے پیئے تو بھی روزے کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ کھانا پینا بالکل بھی نہ چھوڑ دے کہ (کمزوری کی وجہ سے) عبادت ہی نہ کر سکے۔ اس لیے (بزرگوں نے) کہا ہے کہ اتنی ریاضت نہ کرے کہ بدن کی طاقت ہی زائل ہو جائے اور جسم کمزور و لاغر ہو جائے۔ نیز مرغن اشیاء کو بھی (ایک حد تک) استعمال کرتا رہے۔ اگر حیوانی گھی چھوڑ رکھا ہو تو نباتی ضرور استعمال کرے تاکہ دماغ خشک نہ ہو جائے۔

طالب کو چاہیئے کہ نوافل، دعاؤں اور وظائف میں اس قدر مشغول نہ ہو کہ ذکر اور مراقبہ میں خلل آئے۔ لیکن اگر کوئی ایسا مراقبہ ہاتھ لگ گیا ہو جو ہر عمل کے وقت کیا جا سکتا ہو تو بہت مناسب ہے، کیونکہ مراقبہ ہر عمل کے ساتھ مل جاتا ہے۔ جب طالب ''رحمٰن'' کے

---

[1] :۔ سورج کا زرد ہو جانا

[2] :۔ صوفیانہ مدارج طے کرنے کو کہتے ہیں کہ سالک ان منازل سے گذرتا ہوا، وصل یا فنا کے مقام تک پہنچ سکے۔ توبہ، مجاہدہ، زہد، خلوت، ورع، رجا وغیرہ، سلوک کی منازل ہیں۔ (مستفاد از فرہنگ علوم عقلی، تہران ۱۹۶۲ء، صہ ۳۰۱)

[3] :۔ حقیقت کی جمع ہے جس سے مراد اسمائے الٰہی کی حقیقت کا تصور اور یقین ہے، اللہ کے ایک ایک نام یا صفت کو ذہن میں لا کر اس کی حقیقت کو دل میں اتارنے کی مشق کی جاتی ہے۔ (مستفاد از فرہنگ علوم عقلی، صہ ۲۲۹)

اسم کے ذکر میں مشغول ہو تو اُسے ''رحمت کا مراقبہ'' کہتے ہیں۔ نیز اس لیے کہ ''مراقبہ'' کا لفظ ''رقیب'' سے نکلا ہے اور ''رقیب'' نگہبان کو کہتے ہیں۔ یعنی دل کو غیر حق سے محفوظ رکھتا ہے۔ سارے نیک اعمال میں (دل) حق تعالےٰ کے ظہور کے فیض کو دیکھتا ہے۔ کیونکہ حق تعالےٰ کا ظہور تو ہر چیز میں موجزن ہوتا ہے لہذا (طالب) کی محبت اور ناراضگی دونوں خدا تعالےٰ کے لیے ہوتی ہے۔ لہذا (طالب) کے لیے ایسے کام کرنا ممکن نہیں جن سے خدا تعالےٰ ناراض ہو۔ ایسے کام، خواہ انبیاء علیہم السلام ہوں یا اولیاء سب نے ترک کیے ہیں۔

طالب کو چاہیئے کہ ہر لقمہ پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کہے۔ یوں گویا اس نے نور کھایا اور اپنے اندرون کو نورانی کیا اور اگر (کھانا کھاتے وقت بسم اللہ کے بجائے) کسی دوسرے ذکر میں مشغول ہو گیا۔ تب بھی فائدہ ہوگا۔

طالب کو چاہیئے کہ غفلت میں نہ سوئے۔ جب سونے لگے تو وضو کرلے گویا عبادت میں ہے۔ ہر رات میں تھوڑا سا سونا کسی صورت میں بھی ترک نہ کرے کیونکہ سوتے میں، جس چیز کے متعلق چاہے جان سکتا ہے۔ نیز اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھنا روا ہے۔ نیز یہ کہ خواب میں دھوکہ لگنے کا امکان نہیں ہوتا جبکہ بیداری (کی حالت) میں اس کا احتمال ہے۔ خواب کے بغیر (اللہ تعالےٰ کو دیکھنا) مشکل ہے۔ نیز یہ کہ اگر راتوں کو (سونا) چھوڑ دے گا تو دماغ میں خلل آنے کا بھی خدشہ ہے لیکن اگر ہمیشہ جاگنے کا عادی ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ اگرچہ یہ بہت مشکل ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگوں کو (ساری ساری رات جاگتے رہنے کی وجہ سے) یہ عارضہ لاحق ہوا ہے۔ لہذا طالب کے لیے ضروری ہے کہ سونا بالکل نہ چھوڑے۔ اگر رات کو (نیند) نہ آئے تو دن میں سونے کی کوشش کرے۔ اگر بیٹھے بیٹھے سونے کی عادت ڈال لے تو بہت ہی اچھا ہے۔ بعض حضرات ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ جن کے لیے سونا اور جاگنا برابر ہو۔

ایسے لوگ جاگتے میں بھی جو کچھ دیکھتے ہیں غلط نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کو سونے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

طالب کو چاہیئے کہ چار چیزوں کی (از حد) کوشش کرے۔ کم کھانا، کم بولنا، کم سونا اور عامی لوگوں سے کم ملنا، کیونکہ انبیاء (علیہم السلام) اور اولیاء (کرام) نے۔ یہی چار چیزیں اختیار کی ہیں۔ کسی نے (ان چاروں چیزوں کو) بالکل نہیں چھوڑا۔ کھانا اس طرح کم کرے کہ ہر مہینے ایک یا دو لقمے اپنی عادت سے کم کھائے۔ ایک دو مہینے ایسا کرتا رہے گا تو اسے کم کھانے کی عادت ہو جائے گی۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو جو کھانا وہ کھاتا ہے اُسے تول لے۔ ہر روز اسی مقدار سے کھائے اور ہر روز یا دو روز بعد یا تین روز بعد ایک دانہ کم کر دے۔ یا (پکے ہوئے) کدو کا گودا اور بیج وغیرہ نکال کر) پیالہ بنائے اور اس میں عادت کے مطابق کھانا بھر کر کھائے۔ ہر دو روز کے بعد (اس پیالے کو) پتھر پر رگڑ کر تھوڑا سا چھوٹا کرے۔ اس طرح آہستہ آہستہ پیالہ بھی چھوٹا ہوتا جائے گا اور غذا بھی کم ہوتی جائے گی اور یوں (آدمی کے بدن کی) طاقت بھی کم نہیں ہوگی۔ اگر پانی کی مقدار بھی کم کرنا چاہے تو جب پیاس لگے تو ایک کُلّی کر کے پیالہ منہ سے ہٹا لے۔ اگر پھر ضرورت ہو تو ایسا ہی کرے اور اگر پھر بھی ضرورت ہو تو اُسی عمل کو دہرائے۔ اگر پھر بھی ضرورت پوری نہ ہو تو تین بار وہی عمل کر کے پی لے اور ہر بار پیتے وقت "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کہے۔ پہلی بار تھوڑا سا پیئے، اس کے بعد قدرے زیادہ اور اگر پھر بھی طبیعت چاہے تو ذکر کرے۔ اگر چاہے کہ آٹھ پہرہ روزہ رکھے تو پہلے چند دنوں تک مسلسل روزے رکھے، اور کھانا عشاء کی نماز کے بعد کھائے۔ اسی طرح ہر روز تھوڑی دیر سے کھائے۔ یہاں تک کہ سحری کے وقت تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد ایک رات نہ کھائے۔ پھر اگلے روز شام تک نہ کھائے۔ اس طرح ایک دن رات (کا روزہ) ہو جائے گا۔ ایک رات اور دو دن کے روزے کو "طے" کہتے ہیں۔ دو رات اور تین دن کو بھی "طے" کہتے ہیں۔ اگر کوئی

ایک "طے" (کا روزہ) رکھ سکتا ہے تو کوشش کرے کہ دو طے رکھے۔ جو دو رکھ سکتا ہے تین کی کوشش کرے جو تین رکھ سکتا ہے وہ چار کی کوشش کرے، اسی طرح زیادہ سے زیادہ کرنا جائے۔ ایسا کرنے میں اس بات کا خیال رکھے کہ (بدن کی) طاقت کم نہ ہو اور اگر چلنے کی سکت نہ رہے اور جسم لاغر ہو جائے تو "روزہ طی" کو چھوڑ دے۔ ایسی صورت میں اگر "طی" کرے گا تو فائدہ نہ دے گا۔ چاہیئے کہ "طی" کا روزہ کھولتے وقت، چلو بھر پانی یا کوئی تھوڑی سی چیز یا دودھ یا تھوڑا سا کوئی پھل کھانے پہ قناعت کرے اور پیٹ بھر کے کھانا نہ کھائے اور جو چیزیں اوپر بتائی گئیں صرف وہی کھائے تو فائدہ ہو گا۔ یہ چیزیں بھی اگرچہ تھوڑی ہی کھانی چاہئیں۔ لیکن اگر پیٹ بھر کر بھی کھائے تو بھی پیٹ بھر کر کھانا کھانے سے بہتر ہے۔ طعام کے علاوہ دوسری اشیاء کا کم کھانا بہت ہی فائدہ مند ہے۔ اگر آدمی مزدوری کرتا ہے اور روزہ اور دیگر معمولات سے وہ مزدوری کے قابل نہیں رہتا تو وہ اسی قدر روزہ رکھے جس سے مزدوری کا نقصان نہ ہو۔ اگر "طے" کا روزہ کھول رہا ہے تو خشک روٹی کا ٹکڑا کھانا بہت ہی اچھا ہے۔

طالب کو چاہیئے کہ ہر سال کوئی چار مہینے یعنی تین چلے ایسے مقرر کر لے اور ان چار مہینوں میں جس قدر ممکن ہو روزہ رکھے۔ اگر پورے چار مہینے روزہ رکھ سکے تو زیادہ اچھا ہے۔ ان چار مہینوں میں ہر ماہ ایک خلوت[1] یا عزلت[2] یعنی گوشہ نشینی اختیار کرے۔ جو کوئی

---

[1]: گھر یا مسجد میں ایک الگ جگہ پر چند گھنٹوں یا دنوں کے لیے باوضو بیٹھنا جہاں دوسرا کوئی نہ ہو۔ اس خلوت کے ذریعے کوشش کی جاتی ہے کہ کم کھانے، کم سونے، کم باتیں کرنے لوگوں سے کم ملنے اور روزہ رکھنے کی مشق ہو جائے۔ ساتھ ہی زیادہ سے زیادہ وقت ذکر و عبادات میں گذرے۔ اپنے شیخ کا تصور ہو، اُسے مظہر خدا جانا جائے۔ یوں دل کو سوائے یاد الٰہی کے ہر چیز سے خالی کرنا (مستفاد از رسالہ قشیریہ (فارسی ترجمہ) صـ ۱۵۳-۱۵۷، ضیاء القلوب صـ ۶۲ وغیرہ)

(جاری ہے)

چار بار گوشہ نشینی اختیار کرنے میں باقاعدگی برتے گا۔ امید ہے کہ اسے "خلوت" در "انجمن" [۱] نصیب ہو جائے گی اور کوئی (دنیاوی) مصروفیت اُسے عبادات سے نہیں روک سکے گی اور تمام امور کے ساتھ مراقبے کی توفیق بھی اُسے میسّر آئے گی۔ اُسے چاہیے کہ شعبان معظم کی اکیسویں رات سے لے کر رمضان المبارک کی آخری رات تک "خلوت گزینی" اختیار کرے۔ اس کے بعد ذیقعد کی پہلی رات سے لے کر عید قربان کی رات تک "خلوت گزینی" کرے۔ اس کے بعد ذی حجہ کی چودھویں رات سے محرم الحرام کی چوبیسویں رات تک اور پھر رجب المرجب کی پہلی رات سے دسویں شعبان تک خلوت گزیں رہے۔ چاہیے کہ یہ عمل مسجد یا خانقاہ یا صوفیوں کے حجرہ یا ان کے مقبرہ میں کرے اور ان چاروں مقامات کا ادب و احترام پوری طرح ملحوظ خاطر رکھے۔ اگر ان چار جگہوں پر مشکل ہو تو یعنی اپنے یا کسی دوسرے کے لیے پریشانئ خاطر کا باعث ہو تو اپنے گھر کے کسی ایسے گوشے میں بیٹھے جہاں کوئی مداخلت و مزاحمت نہ ہو۔ اگر پورے چار مہینے یہ عمل

---

*۔ گوشہ گیری اختیار کرنا اس طرح کہ حواس ظاہری اور ان سے متعلق اعمال سے معزول ہو جائے۔ حقیقی عزلت یہ ہے کہ طالب خصائل رذیلہ سے نجات حاصل کرے اور فضائل جمیلہ یا صفات پسندیدہ کو اپنے اندر پیدا کرلے۔ (مستفاد از رسالہ قشیریہ (فارسی ترجمہ) تہران ۱۹۶۷ء ، صہ ۱۵۳ تا ۱۵۶ ؛ فرہنگ علوم عقلی صہ ۳۵۷)

[۱]: خواجہ نقشبند کا خیال ہے کہ آیۂ شریفہ "رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله" (النور ۲۴ : ۳۷) میں خلوت در انجمن کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی سالک لکھنے، پڑھنے، کھانے پینے، چلنے پھرنے، کلام کرنے، غرض تمام حالات میں دل خدا کی طرف لگائے رکھے۔ ہر حالت میں اپنے باطن کی طرف دل سے متوجہ رہے اور ظاہری کاموں سے دلی بیگانگی رکھے۔

(مستفاد از قول جمیل صہ ۸۷)

نہ کر سکے تو کبھی کبھی ایک ایک دو دو گھنٹے بھی یہ عمل کرتا رہے تو فائدہ دے گا۔

طالب کو چاہیئے کہ عورتوں (کی صحبت) سے پرہیز کرے اور جب باہر جائے تو زیادہ لوگوں کو اپنے ساتھ نہ لے۔ ہوں تو ہوں، نہ ہوں نہ ہوں۔ ایک یا دو سے زیادہ نہ ہو تو اچھا ہے تاکہ (راستے میں) جماعت فوت نہ ہو۔ حضرت داؤد طائی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور ابن جریر کا قول ہے کہ نمازوں کو جماعت سے پڑھنا فرض ہے۔ یہاں تک کہ جب اکیلا بھی نماز پڑھے تو ان کے نزدیک اس کی نماز جائز نہیں۔

بعض حنفی علماء (جماعت کی نماز کو) واجب کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک ایسی سُنت مؤکدہ ہے جو درجہ کے اعتبار سے واجب سے مشابہ ہے۔ اور شافعی حضرات اسے مستحب کہتے ہیں۔ اگر باجماعت نماز پڑھنا (کسی وجہ سے) مشکل ہو تو اذان و اقامت کہہ کر (اکیلا ہی) پڑھ لے تاکہ جماعت کا ثواب مل جائے۔ اگر ضرورت ہو تو کچھ لوگوں کو ساتھ لے لے۔

طالب کو چاہیئے کہ جب کوئی ضیافت کے لیے دعوت دے اور وہاں گانے والے بھی ہوں اور اس مہمان کو معلوم ہو کہ دوسرے اُن قوالوں کو (انعام) دیں گے تو یہ بھی خالی ہاتھ نہ جائے۔ اگر کوئی کسی عرس میں شرکت کی دعوت دے تو اگر ہو سکے تو کچھ روپے ساتھ لے لے۔ لیکن اگر نہ لے جا سکے تو بھی حرج نہیں۔ اگر عرس کے میزبان و مہمان برابر کی حیثیت کے ہوں تو روپے ساتھ لے جانا ضروری نہیں۔ لیکن روپے (قوالوں وغیرہ کو) اس وقت دے جب کوئی دوسرا دے۔ ایسے مواقع پر سب سے پہلے نہ دے اگر سب سے پہلے دے تو سب کے سامنے نہ دے۔ اگر کوئی صاحبِ ذوق، جو سازوں کی آوازوں کا بھی رسیا ہو، قوالوں کو عرس کے موقع پر کچھ دے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بہر صورت جیسے بھی مناسب حال ہو دے دے۔ اسی طرح لباس (پہننے) کے آداب ہیں۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد چالیس قدم تک (کچھ دیر) ٹہلتا رہے اور دن کا کھانا کھانے کے بعد

اتنی ہی دیر کے لیے آرام کرے۔

طالب کو چاہیئے کہ میزبان کی (مالی) حالت کو پیش نظر رکھے۔ اگر وہ خوشحال ہے اور چند آدمیوں کو کھانا کھلا سکتا ہے تو صرف اُن چند آدمیوں کو ساتھ لے جائے جو اکثر اُس کے ساتھ رہتے ہوں۔ اگر یہ محسوس کرے کہ میزبان صرف دو تین آدمیوں کو کھانا کھلا سکتا ہے تو اُسی تعداد میں آدمیوں کو ساتھ لے بلکہ اگر میزبان سے بھی پوچھے (کہ کتنے آدمی ساتھ لاؤں یا نہ لاؤں) تو اچھا ہے۔ اگر کوئی میزبان ہو جو جانتا ہو کہ مہمان کے ساتھ چند لوگ بھی کھانا کھانے آئیں گے تو اپنے آدمیوں کو ساتھ لے لینے میں مضائقہ نہیں۔ خواہ کوئی مہمان اِس میں مشہور ہو کہ اس کے ساتھ آدمی ہوتے ہیں تاہم میزبان کو پہلے سے بتا دینا زیادہ اچھا ہے اس بات کا قصد نہ کرے کہ وہ صدر مجلس میں بیٹھے گا بلکہ ایسی جگہ بیٹھے جہاں کسی کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ اِس بات کی بھی خواہش نہ کرے کہ سب سے پہلے طشت میرے پاس لایا جائے گا۔ اور کھانا مجھ سے شروع کریں گے جس شخص سے بھی گھر والے شروع کریں یہ خوش رہے، بلکہ کوشش کرے کہ کسی دوسرے سے شروع ہو۔ پہلا لقمہ اپنے منہ میں نہ ڈالے۔ لقمہ چھوٹا لے اور اپنے سامنے سے کھائے۔ بِن بلائے کسی کے ہاں کھانا کھانے نہ جائے۔ لیکن کوئی درخواست کرے تو بے شک جائے۔ چاہیئے کہ اپنی عزت کی خود حفاظت کرے۔ ہر لقمہ پر "سبحان اللہ" کہے یا کوئی دوسرا ذکر کرے۔ جب خود کھانے سے فارغ ہو جائے اور دیکھ رہا ہو کہ دوسرے ابھی فارغ نہیں ہوئے ہیں، آہستہ آہستہ کھاتا رہے۔ یہاں تک کہ دوسرے بھی فارغ ہو جائیں۔ اتنا زیادہ بھی نہ کھا جائے کہ پیٹ میں تکلیف ہو جائے۔ جو کھانا بھی سامنے آئے اُس میں عیب نہ نکالے۔ اگر سمجھے کہ مجھے اس سے نقصان ہوگا تو کم کھائے اور اگر کم کھانے سے بھی نقصان کا اندیشہ ہو تو نہ کھائے اور کہے کہ بہت عمدہ کھانا ہے۔ بڑا اچھا پکا ہے۔ لیکن مجھے چونکہ اس سے پرہیز ہے اس لیے معذور ہوں تاکہ میزبان کی دلشکنی نہ ہو۔ یہ اس صورت میں ہے جب واقعی کھانا عمدہ پکا ہو۔ اگر کوئی پوچھے کہ جب عمدہ پکا ہے تو کیوں نہیں

کھاتے، تو پھر نہ عیب نکالے اور نہ تعریف کرے۔ اگر کھا سکتا ہو کھالے اور اگر نہ چاہے تو نہ کھائے۔ اگر کوئی کہے کہ کیوں نہیں کھاتے تو کہے کہ جتنا طلب تھی کھالیا۔ اگر کہیں کہ کیسا پکا ہے تو کہے کہ اچھا پکا ہے۔ اگر شیخ پوچھے (کہ کیسا ہے) تو جیسا ہو بتادے۔ اگر جانتا ہو کہ دعوت دینے والا آدمی دو تین آدمیوں سے زیادہ کو نہیں کھلا سکتا اور پُر تکلف کھانے بھی نہیں کھلا سکتا اور اس کے ساتھ زیادہ لوگ ہوں تو ان کو ساتھ نہ لے جائے اور اگر ان کو چھوڑ نہ جا سکتا ہو تو دعوت دینے والے کے پاس کوئی عذر کر دے اور میزبان کو وہ عذر مان لینا چاہیئے۔ اگر سمجھے کہ میزبان شرم کی وجہ سے کہہ دے گا کہ اپنے سارے آدمیوں کو ساتھ لے آیئے اور جب دوسرے سُنیں گے تو نکتہ چینی کریں گے تو عذر وغیرہ نہ کرے اور اکیلا ایک خادم کے ساتھ جو جوتا وغیرہ اٹھاتا ہو، چلا جائے اور خادم کو دروازے کے باہر ہی رہنے دے۔ پھر گھر کے مالک سے پوچھے اگر وہ اجازت دے تو (خادم کو) اندر بُلا لے، اگر راضی نہ ہو تو نہ بُلائے۔ یہ بھی اس وقت ہے جب اِس (طالب) کو اندر بلا لیا گیا ہو۔ (اگر میزبان راضی ہو) تو اِس خادم کو کچھ کھانا دے دے۔ اگر موقع نازک ہو اور سمجھے کہ مزید کسی کو اندر بُلانے سے میزبان کا حرج ہو گا تو نہ پوچھے اور اس کے لیے کچھ کھانا باہر ہی بھیج دے۔ بعض مواقع پر ہو سکتا ہے اجازت کی ضرورت ہی نہ ہو تو خادم کو (اندر) بُلا لے اور اپنے سامنے رکھے گئے کھانے میں سے کچھ اُسے دے دے۔ کہ دوسرے لوگ بُرا نہ منائیں۔ کھانے کے متعلق دوسروں کے اعتراضات سے ہر آن بچا جائے۔ اگر میزبان ہر ایک کا حصہ الگ الگ رکھ دیتا ہے کہ خواہ وہیں (سارا) کھالے یا (اس میں سے) تھوڑا کسی کو دے دے تو کچھ کھالے اور کچھ ساتھیوں میں سے کسی کو دے دے۔ اگر جانے کہ مجھے صدرِ مجلس میں بٹھا دیں گے یا جہاں کہیں بھی بیٹھوں صدر بنا دیں گے تو بہت زیادہ انکار نہ کرے اور میزبان یا حاضرین کے کہنے پر صدر نشینِ محفل بن جائے۔ اگر جانتا ہو کہ، کہ صاحب خانہ ارادت مندوں میں سے ہے۔ اور (کھانے کے لیے) جو کچھ لا سکتا ہے۔

بلا نذر دلے آئے گا تو اپنے ایسے آدمیوں کو بھی ساتھ لے جائے جو کھانے میں عیب نہ نکالیں اور اگر (یہ لوگ) عیب نکالنے لگیں تو منع کر دے اور اگر منع کرنے پر بھی باز نہ آئیں تو ساتھ نہ لے جائے۔ نیز یہ کہ کسی کو بھی کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہیئے اور کھانے کے بعد ایسا ظاہر کرے کہ لوگ جانیں۔ اس نے اطمینان سے کھا لیا ہے اور (معمول سے) تھوڑا نہیں کھایا ہے۔ یعنی کچھ اس طرح سے بیٹھے کہ صاحب خانہ سمجھے کہ اس نے سیر ہو کر کھا لیا ہے۔ کھانا اس طرح (احتیاط) سے کھائے کہ انگلیاں نہ لتھڑیں، نیز لب، ناک اور آس پاس کی دوسری جگہوں کو بھی لتھڑنے سے بچائے۔ کوشش کرے کہ لقمے کو تین انگلیوں سے پکڑے، (اس خیال سے) کہ اہل مجلس معیوب جانیں گے یا اس نیت سے کہ کم کھایا جائے۔ یہ بھی نیت کرے کہ اپنے حصہ سے زیادہ نہ کھائے۔ اگر طرح طرح کے کھانے رکھے ہوں تو ہر قسم سے تھوڑا تھوڑا لے کر اپنی بھوک پوری کرلے اگر اپنی عادت یا معمول سے زیادہ کھانے کو جی چاہے تو اتنا زیادہ بھی نہ کھا جائے کہ پیٹ میں تکلیف ہو۔ اور جو لوگ مہمان کے ساتھ گئے ہوں انہیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ یہ بھی چاہیئے کہ خود کھانا اس وقت تک نہ کھائے جب تک سارے ساتھیوں تک (اسی مقدار کا) نہ پہنچ جائے۔ اگر (اس کے) برابر نہیں پہنچا تو (کم از کم) اس سے کچھ کم ضرور پہنچ جائے۔ اگر یوں کبھی نہ کھایا جا سکے اور کھانا کھانے سے احتراز کرنا مشکل ہو تو تھوڑا سا کھالے۔ اگر (طالب کا) شیخ ساتھ ہو اور فرمائے کہ کھاؤ۔ تو بلا چون وچرا کھالے خواہ دوسروں کو ملے یا نہ ملے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے معذور ہو تو ایک دو بار ادب و احترام سے (شیخ کی خدمت میں) عرض کرے۔ وہ اصرار کریں تو جو طبیعت کے موافق ہو وہ کھالے۔ اگر خود (طالب نے) دعوت کی ہو تو سب لوگوں تک کھانا پہنچانے کی کوشش کرے۔ دعوت دینے میں فقیر اور غنی میں امتیاز نہ کرے۔ اگر سب کی دعوت کرے تو کوشش ہو کہ فقرا [illegible] کوئی محروم نہ رہے اور اگر یہ مشکل ہو تو فقرا اور اغنیا کو

ایک ہی دسترخوان پر اکٹھے نہ بلائے۔ ایک وقت میں فقراء کو کھانا کھلادے اور دوسرے (کسی) وقت میں اغنیاء کو کھلادے۔ افضل یہ ہے کہ اگر سب ایک ہی دسترخوان پر بیٹھے ہوں تو سب کو برابر پہنچے۔ جہاں تک ممکن ہو فقراء اور اغنیاء کو ایک دسترخوان پر بلانے سے پرہیز کرے اور ہو سکے تو دونوں کے لیے الگ الگ دن مقرر کرلے۔ بعض بزرگوں نے تو کھانے اور کھلانے کے دن مقرر کر رکھے ہیں۔ بعض نے دن میں (دو بار) کھلانے کی بھی ہمت کی ہے۔ (طالب کے لیے) اگر (دن میں) دو بار کھلانا مشکل ہو تو ایک بار کھلادے، بہر صورت جہاں تک ممکن ہو فقراء کا لحاظ رکھے اور کسی صورت میں بھی ان کو نظر انداز نہ کرے۔ اگر اپنے کسی گہرے دوست کو بھی فقراء کے ساتھ (بٹھا کر) کھانا کھلادے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن دوست کو الگ کھلانا افضل ہے۔ کیونکہ ایسا دوست گو کہ سامنے عیب جوئی نہ کرے گا۔ کھانا کھانے کے بعد (ضرور ناک بھوں چڑھائے گا۔) کھانے کے بعد (سب کے سامنے) کلی نہ کرے سوائے اس کے کہ ضرورت ہو۔ (دوسروں کے سامنے) بہت زیادہ خلال بھی نہ کرے۔ اگر ضرورت ہو تو ایک طرف کو جا کر کرے۔ صرف اپنے سامنے سے کھائے، دوسروں کے سامنے سے اٹھانے کے لیے ہاتھ نہ بڑھائے اگر کئی قسم کے کھانے ہوں تو پہلے روٹی اور گوشت کو کھائے۔ اس کے بعد چاول، پھر شیرینی یعنی کوئی میٹھی چیز کھائے۔ اپنے سامنے سے (گھر لے جانے کے لیے) کھانا اٹھا نہ لے، خواہ دیکھ رہا ہو کہ اس قدر بچا ہے کہ لے جا سکتا ہوں۔ لیکن اگر مہمان فقیر اور کوئی پریشان حال ہو تو وہ بے شک لے جائے اس کا لے جانا بہت اچھا ہے۔ یا ایسا کرے کہ وہ کھانا پڑا رہنے دے اور اگر خود بیٹھا ہے تو تھوڑا تھوڑا کھاتا رہے اگر شیرینی ہو جو سب لوگ لے جا رہے ہوں تو یہ بھی لے جائے۔ کھانے کی ضرورت سے زیادہ تعریف نہ کرے اور عیب تو بالکل ہی نہ نکالے، سوائے اس کے کہ اپنے گھر کا کھانا ہو جو عرس یا کسی کی ضیافت کے لیے پکایا گیا ہو۔ کھاتے وقت بائیں ٹانگ پر بیٹھے اور

دایاں گھٹنا کھڑا کرلے، لیکن اگر مشائخ کے ساتھ ہو، تو دو زانو بیٹھے۔ مشائخ (میں سے کوئی) ساتھ نہ ہو تو بے شک دو زانو نہ بیٹھے۔ کھانے کے فوراً بعد پانی نہ پیئے اور کھانے کے درمیان پانی کم پیئے۔ کھانا کھانے کے بعد اس طرح (ہشاش بشاش) باہر آئے کہ جس سے گھر والا سمجھے کہ مہمان یہ کھانا کھا کر بہت خوش ہوا ہے۔ کھانا کھاتے وقت ہڈیاں یا پھل کے چھلکے دور نہ پھینکے۔ اگر کھانا مشترک ہو تو اس طرح کھائے کہ سارے شریکِ طعام اس سے راضی رہیں۔ کھانا کھاتے وقت روٹی کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کرے۔ ایک روٹی کو ختم کرلے اور پھر دوسری کو شروع کرے۔ اگر کھانے والے زیادہ ہوں اور روٹیاں کم ہوں تو ایک روٹی کے دو دو یا تین تین یا چار چار ٹکڑے کرلے۔ کھانے کے دوران میزبان سے روٹی نہ مانگے۔ البتہ اگر یقین ہو کہ وہ خوشی محسوس کرے گا تو مانگ لے۔ بخیل کی درخواست (کھانے کی دعوت کے لیے) قبول نہ کرے۔ جو کھانا کھلا کر احسان کرنے کا عادی ہو اس کی دعوت بھی قبول نہ کرے۔ اگر شیخ حکم دے دے کہ (فلاں کی) دعوت کو منع نہ کرو چاہے کچھ ملتوی کردو تو ضرور ایسے دعوت کو قبول کرلے۔ اگر دیکھے کہ (اس دعوت کا قبول کرنا) فرض کی طرح ہے لیکن قبول نہ کرسکتا ہو تو اُسے کچھ ملتوی کردے اور ملتوی بھی نہ کرسکتا ہو تو اپنے شیخ سے اپنی مجبوری بیان کردے۔ پھر جیسے شیخ حکم دے اُس پر عمل کرے۔ اگر شیخ کہے کہ اگر مشکل ہے تو (قبول) نہ کر اور مشکل دور ہو جائے، تو اس وقت قبول کرلینا (تو ایسے ہی کرلے) اسی طرح شیخ کو بھی چاہیئے کہ ایسا حکم نہ دے۔ جس کی تعمیل طالب کے لیے پریشان کن ہو۔ صرف ایسے احکام دے جو وہ بآسانی پورے کرسکے۔ زیادہ اچھا یہی ہے کہ ایسے احکام صادر نہ کیے جائیں۔ صرف فرائض، واجبات، موکدہ اور حرام کو چھوڑنے کے متعلق احکام دیئے جائیں اور ہر (طالب) کی ہمت وصلاحیت کے مطابق حکم دے۔ اگر شیخ کسی دنیاوی کام کے متعلق دریافت کرے تو جو کچھ جانتا ہو بڑے ادب سے عرض کردے۔ اگر کئی بار عرض کرنا پڑے، جب بھی کوئی حرج کی بات نہیں

انکار بالکل نہ کرے۔

طالب کو چاہیئے کہ جو کچھ بغیر کسی تکلیف کے لے جاسکے۔ شیخ کی خدمت میں پیش کرتا رہے۔ خواہ کچھ رقم ہو یا کھانا یا کپڑا یا کوئی دوسری چیز۔ اس کی کوشش نہ کرے۔ ضرور کوئی بالکل نئی چیز ہو یا بہت مقدار میں ہو۔ جو کچھ بآسانی ممکن ہو لے جائے۔ شیخ کے لیے ٹوپی نہ لے جائے۔ اگر ضروری ہو تو نئی ٹوپی پیش کرے۔ پرانے کپڑے بھی نہ لے جائے۔ اگر پرانے کپڑے لے جانا ضروری ہوں تو ان کو دھو کر لے جائے اور لوگوں سے نہ کہے کہ میں یہ پرانے کپڑے دھو کر لایا ہوں۔ البتہ مریدوں اور پیر بھائیوں کو، جو دوست اور ہمراز ہوتے ہیں، معلوم بھی ہو جائے تو مضائقہ نہیں لیکن نہ کہا جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ اگر کوئی شیخ فقر و فاقہ میں بسر کرتا ہو تو بالکل نہ بتایا جائے۔ لیکن اگر خوش حالی کی زندگی بسر کر رہا ہو تو خواہ اس کی زندگی میں کہے (کہ میں یہ تحفے وغیرہ لایا ہوں) یا وفات کے بعد کوئی فرق نہیں۔ تاکہ دوسرے بھی اس بات کو اختیار کریں۔ اگر مصلحت کی نیت سے بتائے تو دوسروں کو عیب جوئی نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اعمال کا دارومدار تو نیتوں پر ہے۔

طالب کو یہ بھی چاہیئے کہ شیخ کی داد و دہش پر نظر نہ رکھے اگر وہ دے تو خوش ہو اگر نہ دے یا دوسروں سے تھوڑا دے تو بھی خوش رہے۔ کیونکہ شیخ آزمانے کے لیے ایسا کرتا ہے یا اس کے دل کو غنا بخشنے کے لیے ایسا کرتا ہے۔ یعنی اس کا دل غنی ہے اور شیخ سے بے پناہ محبت ہے۔ پس دینا نہ دینا برابر ہے اور جو دل غنی نہیں ہوتا وہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ شیخ پر اپنا کوئی احسان نہ سمجھے بلکہ اس کا احسان جانے کہ اس نے ہدیہ قبول کر لیا اور رد نہیں کیا۔ اگر شیخ کے لیے قینچی لائے تو سوئی اور دھاگے کے ساتھ لائے۔ اگر چھری یا تلوار وغیرہ لائے تو غلاف میں چھپا کر لائے اور اگر کچھ روپے لائے یا کچھ اور مناسب چیز، تھوڑی یا زیادہ، اُسے بھی لپیٹ کر لائے۔ جو کچھ بھی شیخ کے لیے لائے خود لائے۔ کوئی چیز دوسرے کے ہاتھ نہ بھیجے۔ اگر ہر بار خود لے جانا مشکل ہو تو کبھی خود

لے جائے اور کبھی کسی کے ہاتھ بھیج دے اور اگر یہ بھی مشکل ہو تو دوسرے کے ہاتھ ہی بھیجتا رہے اور اسے لے جانے اور پیش کرنے کا طریقہ سکھائے اور کہے کہ بڑے ادب سے پیش کرے اور اگر شیخ، صاحبِ فقر و فاقہ ہو تو ضرور ہی مخفی طور پر (ہدیہ وغیرہ) دے یہاں تک کہ شیخ کے بیٹوں اور خادموں کو بھی پتہ نہ چلے۔ اگر کوئی چیز پیش نہ کر سکتا ہو تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر پیش کرے تو اُسے پوشیدہ رکھنے کی پوری کوشش کرے اور لوگوں سے نہ کہتا پھرے کہ میں (شیخ کے لیے) فلاں چیز لایا ہوں یا لے گیا ہوں۔ کوئی دوسرا بھی کسی دوسرے سے نہ کہے۔ اِن تحفوں کے بارے میں نہ شیخ کی زندگی میں کسی کو بتائے اور نہ اس کے انتقال کے بعد۔ البتہ اگر شیخ کے کسی طالب با ارادت مند کو، جو عورت نہ ہو، بتا دیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن نہ کہنا افضل ہے۔ اگر کسی مصلحت کی وجہ سے بتانا پڑے تو بتا دے۔ لیکن فخر سے نہ بتائے بلکہ عاجزی سے بتائے بلکہ کہے کہ یہ تحفے دوسرے لوگ لائے ہیں۔ اپنے احباب سے کہے تو اچھا ہے تاکہ وہ بھی اِس روایت کو جاری رکھیں۔ اگر اس کی کوشش کے بغیر یہ ظاہر ہو جائے کہ فلاں شخص لایا ہے تو کوئی حرج نہیں۔ جب طالب (اپنے شیخ کی خدمت میں) آئے تو پہلے اپنے رخساروں کو شیخ کے قدموں پر رکھے۔ اگر شیخ اس طرح بیٹھا ہو کہ رخسار (شیخ کے قدموں پر) ملنا مشکل ہو تو ان کے گھٹنوں یا شیخ کے سامنے کی زمین پر ملے اور اگر دُور ہی زمین پر رخسار مل دے تو حرج نہیں۔ اگر یہ پہلی باریابی متبرک ایام (رمضان المبارک) میں ہو تو بہت اچھا ہے۔ اگر رخسار شیخ کے قدموں یا زمین پر نہ مل سکے تو اپنا ہاتھ شیخ کے قدموں پر رکھے اور پھر اس ہاتھ کو چوم لے۔ اگر یہ بھی نہ کر سکے تو شیخ سے مصافحہ کرے۔ جس کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی شیخ کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھے۔ اس طرح کہ انگوٹھے کو (شیخ کے) انگوٹھے میں یوں پیوست کرے کہ انگلیاں (شیخ کی) انگلیوں سے پیوست نہ ہونے پائیں۔ دوسرے یہ کہ شیخ و مرید اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھیں کہ دونوں کے

انگوٹھے اور انگلیاں ایک دوسرے پر آجائیں۔ تیسرے یہ کہ مصافحہ کرے اور ہاتھ کو جس قدر ہو سکے مضبوطی سے پکڑے اور یہ تمام صفات اس کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

اگر متبرک دنوں میں شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت توبہ کرے تو یہ بڑی سعادت ہو گی اور وہ عنقریب اپنی مراد پالے گا۔ خواہ شیخ ارادت[1] ہو یا شیخ اجازت[2] یا شیخ ارشاد[3]، جب ان کی خدمت میں حاضری دے کر واپس آئے تو اُلٹے پاؤں لوٹے اور باہر آکر، پشت اُس جانب کرے۔ جب تک شیخ کے سامنے رہے اپنی دونوں آنکھیں شیخ کے چہرے پر لگائے رکھے۔ جیسے مبتلائے (محبت) لگائے رکھتا ہے اور اگر واقعی محبتِ شیخ میں گرفتار ہو تو کیا کہنے۔ اگر شیخ (کے چہرے) کا خیال نہ کرے تو کسی دوسری جانب بھی توجہ نہ کرے اور تسبیح و تلاوت و ذکر وغیرہ شیخ کے ساتھ کرے۔ کیونکہ جب تک شیخ حاضر نہ ہو ذکر وغیرہ فائدہ نہیں دیتا۔ یا اگر شیخ حکم دے کہ میرے سامنے پڑھو (تو پڑھنا چاہیئے)۔ اگر شیخ کی عدم موجودگی میں پڑھے تو آہستہ پڑھے۔ شیخ کی موجودگی میں لوگوں کی باتیں بالکل نہ

---

[1]: طلب حق میں دل کا حرکت میں آنا ارادہ کہلاتا ہے۔ دنیاوی علائق کا ترک کرنا اس کی علامت ہے اس لیے صوفیا راہ سلوک کی منزلوں کے نقطۂ آغاز کو ارادہ کہتے ہیں۔ لہٰذا شیخ ارادت وہ ہو گا جو مرید کو سلوک کی راہ پر پہلا قدم رکھوائے۔ وہ خود مرید بنا سکتا ہے۔ لیکن مرید کو مزید بیعت لینے کی اجازت نہیں دے سکتا، اسے "مجازِ صحبت" اور "شیخِ صحبت" بھی کہتے ہیں۔
(استفادہ از رسالہ قشیریہ (فارسی) ص ۳۰۹ اور فرہنگ علوم عقلی ص ۴۵ - و افادات مولانا محمد احمد جامعہ اسلامیہ بہاولپور)

[2]: شیخ اجازت، اسے کہتے ہیں جو مرید بھی کر سکتا ہے اور اپنے مرید کو آگے مرید کرنے کی اجازت بھی دے سکتا ہے۔ (افادات مولانا محمد احمد صاحب جامعہ اسلامیہ بہاولپور)

[3]: ایسا شیخ ہوتا ہے جو عامۃ الناس کی اصلاح کے لیے مسند ارشاد پر فائز کیا گیا ہو۔ یعنی ہر کس و ناکس اس سے فیض حاصل کرتا ہے اور ہر سالک و شیخ اس کے ارشادات سے مستفیض ہو سکتا ہے۔

(افادات مولانا محمد احمد جامعہ اسلامیہ، بہاولپور)

کرے۔ بلکہ دوسروں کی طرف بہت کم توجہ کرے۔ ان کے آتے اور جاتے وقت جب کھڑا
ہو تو ایسے کھڑا ہو کہ عمومی تعظیم سے بڑھ کر (اظہار) عاجزی کرے۔ اگر کسی کے آنے پر شیخ
اُٹھے تو یہ بھی اٹھ کھڑا ہو۔ اگر آنے والے کی تعظیم سے اِس کی توہین کا پہلو نکلتا ہو تو اپنے
شیخ کی اتباع سمجھ کر ہی کھڑا ہو جائے۔ اس حد تک اپنے شیخ کی تعظیم کرنی چاہیئے۔ (کھانے
پینے کی اشیاء میں سے) جو کچھ شیخ دے اُسے کھڑا ہو کر نہ لے۔ لیکن اگر قرآن کریم، (مجموعہ
احادیث یا کوئی دوسری تصوّف کی کتاب ہو تو کھڑا ہو کر لے۔ اور جب شیخ کی خدمت میں
آئے تو بہت ادب سے آئے اور بہت آہستہ سے آئے۔ اِسی طرح جاتے وقت بھی
(آہستہ اور ادب سے جائے)۔ شیخ سے اُن تسبیحات، اذکار، دعاؤں وغیرہ کے علاوہ طلب
نہ کرے جو انہوں نے (اس کے لیے) مقرر کر رکھی ہوں۔ اگر شیخ وسیع القلب ہو اور طالب
کو (مزید وظائف کی) ضرورت بھی ہو تو معیّن شدہ کے علاوہ بھی طلب کر سکتا ہے۔ اشارے
سے بھی اور واضح طور پر بھی۔ ایک بار یا چند بار۔ دے یا نہ دے کسی دوسرے سے
اِس کا گلہ نہ کرے۔ اگر شیخ صاحبِ استطاعت نہ ہو اور طالب دولت مند ہو (ایسی
صورت میں) اگر شیخ اِسے کچھ دے تو واپس نہ کرے۔ اگر دیکھے کہ شیخ تو آئے دن کچھ نہ کچھ
بخشتا رہتا ہے حالانکہ اس کے اپنے پاس کم ہے تو (صرف) ایک یا دو یا تین بار لے لے (پھر نہ
لے)۔ اِسی طرح اگر دیکھے کہ شیخ تو خود فاقہ مستوں میں سے ہے اور شیخ کو اپنے حسبِ حال
داد و دہش کرنی چاہیئے تو جتنی بار شیخ نے اس طرح کے احسان کیئے ہوں ان کا ذکر کرے۔
ایک بار، دو بار بلکہ تین بار۔ اگر دیکھے کہ شیخ اِس کا ذکر کرنے سے خوش ہوتا ہے تو بار بار
اس کا ذکر کرے لیکن ادب کے دائرے میں رہتے ہوئے۔ اگر طالب کو معلوم ہو کہ اِس
داد و دہش کی شیخ کو خبر ہی نہیں۔ (بلکہ اس کے گھر والے یا ملازمین یہ کام کرتے ہیں) اور
شیخ اس سے زیادہ اعلیٰ وارفع کام (اذکار و عبادات) میں مشغول رہتا ہے۔ تو جس قدر
ظاہر کیا جانا مناسب ہو اسی قدر شیخ کی نیکیوں کا ذکر کرے اور کہے کہ آپ اتنی داد و دہش نہ

کیا کریں۔ وہ بھی بڑے ادب سے۔ سختی سے نہ کہے۔ یعنی کہتے وقت طالب کا لہجہ بڑا نرم ہو، متین[1] ہو اور پوری طرح مؤدب ہو اور کہنے میں کوئی گستاخی نہ کر بیٹھے۔

شیخ کی موجودگی میں کوئی چیز نہ کھائے، سوائے اس کے جو شیخ خود دے اور کھانے کا حکم کرے۔ اس چیز کو ظاہری بلکہ باطنی طور پر بھی کھائے۔ کیونکہ یہ طالب کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسری جگہ سے لے کر کھانا مشکل ہوتا ہے۔ شیخ پر اس قدر اعتماد ہو کہ جو کچھ وہ کہتا یا کرتا ہے اللہ کے حکم سے کہتا اور کرتا ہے۔ جو کچھ فیض مجھے پہنچ رہا ہے وہ صرف شیخ کے طفیل پہنچ رہا ہے۔ کیونکہ میں اس سے فیض حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ طالب کا کوئی لمحہ مراقبہ سے خالی نہ گزرے اور مراقبہ کے لیے کوئی خاص جگہ مقرر نہ ہو۔ جو کوئی اس طرح کرتا ہے اُسے مراقبہ میں خدائے تعالےٰ کا دیدار ہوتا ہے۔ چاہیئے کہ ضرورت کے وقت، مراقبہ کی نیت سے غسل نہ کرے اور اگر (غسل کی) ضرورت ہو۔ مراقبہ پھر بھی نہ چھوڑے اسی طرح جب کسی ضرورت سے سَتر کھولنا پڑے، تب بھی لحظہ بھر کے لیے مراقبہ نہ چھوڑے تو اس کا عظیم اثر ہوتا ہے۔ اگر شیخ کو خواب میں بدشکل دیکھے تو سمجھ لے کہ یہ میرے گناہ ہیں۔ خدا تعالےٰ نے میرے گناہوں کی شامت سے شیخ کو اس شکل میں دکھایا ہے۔ لہٰذا استغفار میں مشغول ہو جائے۔ شیخ کے گھر والوں کا بھی، جہاں تک ہو سکے، لحاظ رکھے بشرطیکہ اپنے کام میں کوئی نقصان نہ ہو۔ اس طرح شیخ کے مریدوں خلفاء، ملازموں اور شاگردوں سے بھی مروّت برتے۔ شیخ کی بیوہ یا مطلقہ سے نکاح نہ کرے البتہ شیخ کی بیٹی سے نکاح کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اپنی زندگی میں جو جو واقعہ پیش آئے سب کا شیخ سے ذکر کیا جائے۔ اگر شیخ اپنی زندگی کے واقعات بیان فرمائے تو یہ عین مراد ہے اگر نہ کہے تو خود نہ پوچھے اور سمجھے کہ میرا فائدہ اسی میں ہے۔

---

[1] فقولا لہ قولاً لیناً (طٰہٰ ۲۰ : ۴۴) کے مطابق ایسی بات ہمیشہ نرم اور ملائم انداز ہی میں کہنی چاہیئے۔

جتنا زیادہ ہو سکے شیخ کی خدمت میں حاضر رہے، سوائے ان اوقات کے جن میں شیخ آرام فرماتے ہوں یا اکیلے کوئی وظیفہ کرتے ہوں یا حرم میں جاتے ہوں۔ جمعہ کے روز ضرور شیخ کی زیارت کرے بلکہ اگر ہر روز کر سکے تو یہ زیادہ اچھا ہے۔ اگر ہر جمعہ کو بھی مشکل ہو تو ایک مہینے کے بعد ضرور زیارت کرے۔ اگر مہینے کے بعد بھی مشکل ہو تو ہر سال ضرور زیارت کرے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو آسانی سے جتنی مدت کے بعد کر سکے۔ یہ شیخ کے مراقبہ (تصور میں لانے) سے کبھی غافل نہ ہو۔ اسی طرح شیخ کی قبر کا بھی ہمیشہ مراقبہ کرتا رہے۔ اسی طرح شیخ کی یا شیخ کی قبر کی زیارت سے کبھی غافل نہ ہو۔ دین کے متعلق شیخ کے فرمانے کی کبھی تردید نہ کرے بلکہ اس پر یقین و عمل کو واجب جانے۔ اگر کسی دنیاوی کام کے بارے میں شیخ کوئی بات کہے اگر ممکن ہو تو اس پر عمل کرے اور اگر مشکل ہو تو بے شک نہ کرے۔ اگر دوبارہ شیخ سے کہے کہ یہ مشکل ہے پھر بھی شیخ کہے تو عمل کرے اور بالکل ہی ممکن نہ ہو تو (اس پر عمل) نہ کرے۔ شیخ کو بھی چاہیئے (اس بات کو) محسوس نہ کرے اور اگر محسوس کرے بھی تو کوئی حرج نہیں۔ اگر موت یا کسی دوسری وجہ سے شیخ دور ہو جائے تو کسی دوسرے مرشد کے ہاتھ پر بیعت کرے۔ یعنی اگر ضرورت ہو تو۔ کیونکہ آداب میں دونوں طرح کی اجازت ہے (یعنی چاہے بیعت ثانی کرے یا نہ کرے)۔ اگر کوئی طالب کے سامنے اس کے پیر کو برا کہہ رہا ہو تو وہاں سے اٹھ کر چلا جائے۔ اگر کسی وجہ سے (اٹھ کر چلے جانا) مشکل ہو تو دل میں ضرور ناراض ہو اور اس کی بات طرف دھیان ہی نہ دے۔ شیخ کے نام کا روزانہ سو بار ورد کرے۔ پنجاہ بار کہے "یا فلاں مولانا" اور پنجاہ بار "یا شیخ فلاں" کہے اور اگر پانچوں نمازوں کے وقت دس دس بار کہے تو یہ بڑی سعادت ہوگی۔

شیخ بھی یہی چاہتا ہے کہ شیخ کا نام لے کر مرید فیض حاصل کرے، اس لیے شیخ کے نام کا مراقبہ کرنے کا بھی (طالب کو) حکم کرے تو اس کا بہت فائدہ ہوگا۔ مرید بھی شیخ کا نام

لے کر، اس سے فیض حاصل کرتا ہے۔ جو کچھ شیخ سے پائے اس کی قدر کرے۔ جو بات شیخ کہے، اگر مرید سمجھے کہ اس سے پیر کا نقصان ہوگا تو بتا دے اور جو کام مرید کرے وہ بھی اگر پیر کے لیے فائدہ مند نہ ہو جب بھی عرض کر دے۔ جو بات بھی پیش آئے، جو عمل بھی کرے، مرید کو چاہیئے کہ اسے اللہ تعالےٰ کا کرم اور شیخ کی برکت جانے، اپنی بڑائی نہ خیال کرے۔ شیخ کے دوسرے مریدوں اور ارادت مندوں کا بھی لحاظ رکھے یہ جانتے ہوئے کہ ان میں سے ہر ایک نے شیخ سے فیض حاصل کیا ہے۔ شاید مجھے وہ فیض نصیب نہ ہوا ہو۔ اس اعتبار سے وہ مجھ سے افضل ہیں۔ شیخ کے مزار اور گھر بار کا ادب کرے۔ شیخ سے جو فیض ملے اُسے اپنی خوش قسمتی سمجھے۔ نماز کی حالت میں، شیخ کو اپنے پاس تصور کرے۔ مرید جو صرف شیخ کے قدموں (کی برکت) سے آگے بڑھا ہوتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ ہمیشہ اور ہر حال میں، شیخ کی اتباع کرتا رہے اور جانے کہ مجھے اللہ کے فضل اور شیخ کی برکت سے یہ مقام ملا ہے۔ مرید کی (ہمیشہ) یہ کوشش ہو کہ شیخ کی خدمت میں بڑے ادب سے رہے یہاں تک کہ اپنی ہستی کو مٹائے رکھے۔

مریدی کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ شیخ کی موجودگی میں، شیخ کے مراقبہ میں ایسا مسرور و محفوظ ہو۔ جیسے ماں کی گود میں بچہ۔ ایسی حالت میں بچہ ماں کے سوا کسی کی پروا نہیں کرتا اور ماں کے علاوہ کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔ اور ماں جس چیز میں بچے کا فائدہ دیکھتی ہے وہی دیتی ہے۔ اس طرح مرید بھی کسی دوسرے کی پروا نہ کرے اور کسی دوسرے سے کوئی چیز نہ مانگے۔ اگر کسی دوسرے سے کوئی فائدہ پہنچ بھی جائے تو اسے بھی شیخ ہی کا فیض جانے۔ اپنے آپ کو شیخ کے پاس مردے کی طرح سمجھے۔ جس طرح غسل دینے والا مردے کو غسل دے کر پاک کر دیتا ہے۔ پھر کفن پہنا کر اس سے جدا ہو جاتا ہے۔ شیخ کی مثال بھی غسل دینے والے کی ہے۔ کہا جا چکا کہ بدنصیب ہے وہ شخص جو شیخ کی صحبت سے دور ہونے کی کوشش کرے اور شیخ کے ارشادات کو پسِ پشت ڈال دے۔ شعر:

جو کچھ بھی اِس دنیا میں ہے سب صحبت کا اثر ہے۔ ورنہ ایک مٹی کا ڈھیلا مصری کی قیمت کیسے پا سکتا ہے۔

بقول شاعر (سعدی علیہ الرحمہ):

ایک روز حمام میں ایک محبوب شخصیت نے خوشبودار مٹی میرے ہاتھ میں دی۔ میں نے اُس مٹی سے کہا کہ تو کوئی کستوری ہے یا عنبر (صندل گلاب زعفران کا مجموعہ) ہے کیونکہ میں تمہاری دل کو لبھانے والی خوشبو سے مست ہوا جاتا ہوں۔ کہنے لگی کہ میں تو وہی ناچیز مٹی تھی۔ لیکن ایک مدت تک گلاب کے پھول کی صحبت میں رہی ہوں۔ اسی ہم نشین کے جمال و کمال کا اثر ہے۔ ورنہ میں تو (اپنی ذات میں) وہی مٹی ہوں۔ اس سے مراد باطنی صحبت ہے۔ لیکن اگر ظاہری صحبت بھی ہو تو بہت ہی اچھا ہے۔ اگر شیخ کہے کہ فلاں آدمی کو کوئی چیز دو۔ اگر آسان ہو تو دے دے۔ لیکن اگر مشکل ہو تو نہ دے۔ نہ دے سکنے کی صورت میں شیخ کو کبیدہ خاطر نہ ہونا چاہیئے اور اگر ہو بھی تو حرج نہیں۔ شیخ کے لیے زیادہ اچھا یہی ہے کہ ایسا حکم دے ہی نہیں۔ صرف اس شخص کو ایسا حکم دے جو خوش حال اور عالی ظرف ہو اور دوسروں کو کوئی چیز دینے میں اُسے کوئی دشواری نہ ہو۔ اگر شیخ اپنے مریدوں سے کہے کہ فلاں مفلس کو کچھ دو تو جس قدر دے سکے اچھا ہے۔ اگر عُذر پیش کر دے، جب بھی کوئی حرج نہیں۔ شیخ کو چاہیئے کہ کوئی مقدار مقرر کر کے مریدوں سے کہے اور خود بھی جو کچھ دے سکتا ہو دے۔ معین کرتے وقت ایسی مقدار معین کی جائے جو کسی کے لیے مشکل نہ ہو۔ بلکہ کہے کہ جس کسی کو یہ مقدار دشوار نہ ہو وہ دے۔ اگر شیخ مقرر نہ کرے تو وہ مقدار جو طالب کے لیے دینا آسان ہو دے دے۔ یا جو دل میں آئے شیخ کی خدمت میں عرض کر دے۔ (کہ میں اس قدر دے سکتا ہوں)۔ اگر شیخ جدا ہو چکا ہو تو شیخ کا تصوّر اس طرح کرے، جیسے وہ ابھی ایک گھنٹہ پہلے جُدا ہوئے ہیں۔ یہ طریقہ آزمایا ہوا ہے۔ جو کوئی اس پر عمل کرے گا اس کی حقیقت کو جان لے گا۔ طالب کو چاہیئے کہ شیخ کی

کرامات اور خلاف عادت باتیں دیکھنے کی کوشش نہ کرے۔ اس بات پر بن دیکھے ہی یقین رکھے کہ شیخ کے پاس کرامات ہیں۔ اگرچہ ان کا اظہار نہیں کرتے۔ اگر شیخ کہے کہ فلاں شیخ پر بھی اعتقاد رکھو اور تجھے اُس سے فائدہ پہنچے گا تو اس پر اعتقاد رکھے اور فیض کو دونوں کی طرف سے جانے۔ جب بھی (طالب کو) کوئی الہامی باتیں پیش آئیں تو سب اپنے شیخ سے عرض کرے لیکن اکیلے میں عرض کرنا افضل ہے۔ شیخ کے مزار پر حاضر ہو کر بھی (خدا سے مدد کا طالب ہو اور شیخ کو اپنے بدن میں روح کی طرح تصور کرے۔ سماع[۱] کے وقت عظمت و بڑائی والے خطاب شیخ کے لیے تصوّر کرے اور عاجزی و انکساری والے خطابات اپنے لیے تصور کرے۔ تاکہ (ذوق) سماع میں ترقی ہو (اور کمی نہ ہو) شیخ کے حضور ہمیشہ ایسے رہے جیسے آج نو آموز طالب آیا ہے اور کچھ نہیں جانتا۔ شیخ کے ہوتے ہوئے کسی کی طرف توجہ نہ کرے، خواہ ابدال اور اوتاد سے ہی کیوں نہ ملاقات ہو۔ جو کچھ شیخ کرے اسے حجت و دلیل[۲]

---

[۱] :۔ اشعار کو ترنم سے پڑھنے والے کی آواز سننا "سماع" کہلاتا ہے۔ صوفیاء نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث مبارکہ "زینوا اصواتکم بالقرآن" سے اس کا جواز نکالا ہے۔ اس سے سننے والے کے دل کو جلا ملتی ہے بعض کو اشعار کے مفہوم سے اور بعض کو گانے والے کی آواز سے۔ جو لوگ زیادہ متاثر ہوتے ہیں وہ وجد میں آجاتے ہیں۔ اس کے آداب و احکام مفصل ہیں۔ جن میں صوفیاء کا اختلاف بھی ہے۔ (کشف المحجوب (اردو ترجمہ) صہ ۳۰۳، ۳۹۸؛ رسالہ قشیریہ (فارسی ترجمہ) صہ ۵۹۱ - ۶۲۱)

[۲] :۔ راہنما اصول کو دلیل و حجت کہتے ہیں۔ دلیل دو قسم کی ہوتی ہے۔ تحقیقی اور الزامی، تحقیقی وہ جسے کوئی جھٹلا نہ سکے، اور الزامی وہ جس سے اختلاف ممکن ہو۔ اس لیے شیخ کا عمل، جو اس کے اپنے علم و مقام کے مطابق ہوتا ہے۔ مرید کے لیے دلیل نہیں بلکہ جو اس کا فرمان ہو وہ قابل اطاعت ہوتا ہے۔

(مستفاد از: فرہنگ علوم عقلی، صہ ۲۶۱)

کے طور پر پیش نظر نہ رکھے۔ لیکن جو کچھ وہ فرمائے اسے حجت سمجھے۔ کسی صورت میں بھی شیخ کا گلا نہ کرے۔ اور ہر روز اپنے شیخ کے لیے خدا تعالےٰ سے مدد مانگے۔ ایک قوم کے لیے شیخ کو ایسے سمجھے جیسے ایک امت کے لیے نبی۔ البتہ شیخ کو نبی کے تابع جانے۔

طالب کو چاہیئے کہ جواں مرد ہو اور پست صفات سے بچنے کی کوشش کرے اور اپنے اعمال پر اعتبار نہ کرے۔ اکثر تنہا رہنے کی کوشش کرے۔ اگر دن میں یہ مشکل ہو تو رات میں ضرور تنہا رہے اور اپنی بیوی کے پاس زیادہ نہ رہے۔ جب بیوی کے ساتھ خلوت کرے تو پہلے دس بار "المتکبو" کہے اور اگر باوضو رہے تو زہے نصیب ورنہ تیمم سے ضرور رہے جماع کے وقت خود دائیں جانب اور بیوی کو بائیں جانب رکھے۔ ایسے میں نہ منہ قبلہ کی طرف ہو نہ پیٹھ۔ بیوی سے خلوت کرتے وقت نیت کرے کہ اولاد حق پرست ہو یا نیت کرے کہ میرا اور میری بیوی کا نطفہ ضائع نہ ہو، اور اپنے نفس کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے استعمال نہ ہو جائے۔ اور ہر وقت (رزق) حلال کھانے کا ارادہ کرے۔ اگر زمانے کے حالات ایسے ہوں کہ حلال و حرام کی تمیز نہ رہے تو اپنی طرف سے پوری احتیاط کرے۔ اگر احتیاط کرنا مشکل ہو تو اکثر روزہ رکھا کرے تا کہ احتیاط کرنا آسان ہو جائے۔ اگر رسمی روزہ مشکل ہو تو کھانے پینے میں کچھ کمی ضرور کر دے اور پھر کھانے پینے کی کمی کے بعد روزہ رکھنے کی کوشش کرے۔ شیخ کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ رہے اور ادب کو ملحوظ رکھے۔ اگر (اس راہ میں) کچھ مشاہدات ہوں، خواہ خواب میں یا بیداری کی حالت میں ان سے بلاوجہ متاثر نہ ہو اور نہ ان پر مغرور ہی ہو۔ اپنے آباء و اجداد، سید ہونے

لہ: حجت اُس خاص دلیل کو کہتے ہیں جو یقین بنانے اور مقصود پانے کے لیے مفید ہو جس کے سبب مخالف پر غلبہ حاصل کیا جا سکتا ہو۔ حجت کی متعدد اقسام ہیں۔ الزامی اقناعی اور قطعی وغیرہ۔ شیخ کا ہر فرمان طالب کے لیے حجت قطعی ہوتا ہے۔

(مستفاد از فرہنگ علوم عقلی، ص ۲۱۲)

مشائخ میں سے ہوتے، عالم یا عامل ہونے پر فخر نہ کرے۔ اپنے سلسلہ (تصوف) کو دوسروں پر ترجیح نہ دے۔ اپنے لیے کوئی مخصوص لباس مقرر نہ کرے۔ جو لباس بھی میسّر آئے پہن لے۔ البتہ اگر درویشوں کا سا لباس پہنے تو زیادہ اچھا ہے۔ لیکن لباس کی وجہ سے کسی پریشانی کا شکار نہ ہو۔ ہر وقت سوز و شوق کے وظیفے پڑھتا رہے اور اس بات کی تمنا کرے کہ "واصل بحق"[1] (پہنچے ہوئے) لوگوں کے زُمرے میں داخل ہو جائے کسی پر بدگمانی نہ کرے خواہ جوگی ہو یا کوئی اور۔ اس بات کی خواہش نہ کرے کہ اُسے کچھ کرامات نصیب ہوں اور لوگوں کے دلوں یا غیب کی باتیں اسے معلوم ہونے لگیں۔ کیونکہ یہ تو ایک مصیبت ہے۔ اگر شیخ کہے کہ فلاں شخص میرا مرید نہیں تو (شیخ سے) اپنی ارادت ختم نہ کرلے۔ لیکن اگر کوئی مرید کہے کہ فلاں شیخ میرا شیخ نہیں تو (اس مرید سے) بے شک محبت ختم کرلے کیونکہ اس سے میل جول کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اسی طرح کہا گیا ہے کہ جب تک کسی (شیخ) پر اعتقاد قائم نہ ہو، مرید نہ بنے اور جب بن جائے تو کبھی اُن پر بدگمانی نہ کرے شیخ کے سامنے بے ہودہ اور زیادہ باتیں نہ کرے۔ شیخ کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرے اور نہ کسی کا گلہ کرے۔ لیکن اگر شیخ خود پوچھے تو بتا دے۔ بشرطیکہ اس میں شیخ کا یا اپنا دینی فائدہ ہو۔ ایسی بات بھی بڑے ادب سے کہے۔ شیخ کے سامنے ایسی بات نہ کرے جس سے اُسے غصہ آجائے۔ اپنے عیب بھی شیخ کے سامنے نہ کہے۔ لیکن اگر پوچھے تو بتا دے بشرطیکہ بتانے میں اپنا کوئی دینی فائدہ ہو۔ اور صدق دل سے

---

[1] واصل بحق، ایسے مقرب خدا شخص کو کہتے ہیں جو سلوک کی منزلیں طے کرتا ہوا "فنا فی اللہ" تک پہنچ چکا ہے۔ واصلین کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو مخلوق کی راہنمائی کرتے ہیں۔ انہیں مشائخ کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو مخلوق کی راہنمائی نہیں کرتے۔ بس اپنی ہی عبادات میں مشغول رہتے ہیں، یہ حضرات مخدوم کہلاتے ہیں۔
(مستفاد از فرہنگ علوم عقلی، ص ۶۱۴)

اپنے عیبوں کو دُور کرنے کے لیے خدا سے مدد مانگے۔ دل میں اس بات کا یقین کرے کہ اس کی طریقت[1] و حقیقت[2]، خلاف شریعت نہ ہو اور ان میں سے کسی کو دوسری کے بغیر صحیح یا مکمل نہ جانے۔ جب تک اپنے شیخ سے نزدیک ہو۔ دوسرے شیخ کے ہاتھ پر بیعت نہ کرے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے دور ہو جائے تو دوسرے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں حرج نہیں۔ یا اگر اپنے شیخ سے پوچھنا مشکل ہو یا سمجھتا ہو کہ شیخ یہ علم نہیں جانتا یا یہ کہ شیخ سے لینا مشکل ہے تو دوسرا پیر ماننا اچھا ہے۔ اگر اپنا شیخ بہت سے علوم جانتا ہو اور اس سے پوچھنا بھی مشکل نہ ہو تو کیا کہنے۔ جو فیض کسی ایک شیخ سے حاصل کرے، سمجھے کہ یہ دونوں کی برکت سے حاصل ہوا ہے۔ اگر اتنی (روحانی) قوت نصیب ہو جائے کہ شیخ کی روح یا شیخ کے بتائے ہوئے کسی نسخہ پر عمل سے اپنی مشکلات حل کر سکتا ہو تو شیخ سے دور یا نزدیک رہنا برابر ہوگا۔ ہر روز سماع کی مجلس میں جائے۔ اگر وہاں دوسرے لوگ سماع کے آداب کی رعایت نہ کر رہے ہوں تو یہ خود ضرور اُن آداب کا لحاظ رکھے اور اگر آداب کی رعایت نہ رکھ سکتا ہو تو مجلس سے باہر چلا جائے "آمدن بارادت و رفتن باجازت" (یعنی آنا اپنے ارادے سے اور جانا اجازت

---

[1]: احکام خداوندی کی تعمیل اور عبادات میں اخلاص پیدا ہو جانے کے باعث جب سالک کو ایک خاص روحانی یا تصوراتی سیر کرائی جاتی ہے تو اُسے طریقت کہتے کہتے ہیں۔ جو حقیقت کی منزل مقصود تک پہنچنے کا راستہ ہے۔

(مستفاد از فرہنگ علوم عقلی، ص ۲۴۳)

[2]: حقیقت سے کئی مفہوم لیے جاتے ہیں۔ حقیقت انسان اس کی رُوح ہے۔ حقیقت دنیا فنا ہے۔ دنیا و آخرت کے بارے میں سارے حالات کا انسان پر کُھل جانا حقیقت علم ہے۔ گویا خدا کی خدائی کو پا جانا حقیقت ہے۔

(مستفاد از فرہنگ علوم عقلی، ص ۲۳۰)

سے) کا مقولہ سماع کی محفل کے بارے میں (درست) نہیں ہے۔ اگر شیخ کی زندگی میں اُن کا کوئی عیب دیکھے تو سمجھے حضرت شیخ معصوم (بے گناہ) ہیں، ہماری آزمائش کے لیے ایسا دکھاتے رہے ہیں۔ اگر کسی کا دادا یا باپ کسی کا مرید ہوا اور وہ پیر کہے۔ میں نے تمہارے ہونے والے بیٹے کو بھی مرید کیا تو اس شخص کو چاہیئے وہ (بڑا ہو کر) اُس پیر کو اپنا مرشد جانے، اور وہ مرید اپنے مرشد کا ایسا ادب اور احترام کرے کہ جس سے ظاہر ہو کہ اس کا پیر ہے۔ کیونکہ اس کے لیے تو (نیا پرانا) دونوں برابر ہیں۔ اگر سمجھے کہ یہ پیر ابھی اتنی گہرائی کو نہیں پہنچا تو بے شک اس کے ہاتھ پر بیعت نہ کرے۔ ایسے پیر کا مرید بن جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن اُسے چھوڑ دینا زیادہ اچھا ہے۔ اگر کوئی اپنے شیخ کی قبر پہ جا کر مرید بنے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ (کسی زندہ شیخ کا بھی) مرید بنے۔ اگر مرید کو بہت شہرت حاصل ہو جائے تو اُس پر مغرور نہ ہو بلکہ سمجھے کہ کسی گناہ کی وجہ سے یہ بلا نازل ہوئی ہے ورنہ آئندہ کسی بڑی محرومی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چاہیئے کہ فقیروں کو اچھا سمجھے۔ اگر فقیر سب کے سامنے سوال کرے تو اس کو سب کے سامنے ہی دے دے اگر سوال کرنے والا در پردہ سوال کرے تو اُسے در پردہ ہی دے۔ خواہ سوال کرنے والے کا باطن (روشن) ہو یا نہ۔ کسی دینی مصلحت کے بغیر کسی کو نہ بتائے کہ میں نے دیا ہے، خواہ لوگوں کو معلوم ہو جائے یا نہ، صرف اتنی مقدار میں (فقیروں کو) دے جو اس کے لیے مشکل نہ ہو اور اس کا اپنا کام کھٹرا نہ ہو جائے۔ ظاہری طور پر اپنے شیخ کا لباس اختیار کرنے کی ضرورت تو نہیں۔ لیکن اگر اختیار کر لے تو زیادہ اچھا ہے اور کسی دوسرے (نیک) عمل میں (اتباع پیر کی) کوشش کرلے۔ اگر لوگ اس سے نصیحت حاصل کرنے آئیں تو نصیحت کرنے سے پرہیز ہی کرے۔ اس طرح کہ کسی کی دل شکنی بھی نہ ہو۔ ورنہ نصیحت کرے بلکہ شیخ کو چاہیئے کہ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کے سوا، کسی کو نصیحت نہ کرے۔ چاہیئے کہ خوف کھاتا رہے تاکہ ترقی کی راہ پہ گامزن رہے اور اگر کوئی شیخ نصیحت گوئی کو چھوڑ کر اپنے

کام میں مشغول رہے تو بہت اچھا ہے۔ اگر سمجھے کہ نصیحت کرنے سے اس کے اپنے کام میں خلل آتا ہے تو نہ کرے۔ اگر کسی طرح نصیحت وغیرہ کر سکتا ہو تو کوئی حرج نہیں۔ اگر شیخ سے پوچھنا مشکل ہو یا سمجھے کہ شیخ یہ علم نہیں جانتا یا سمجھے کہ شیخ سے سیکھنا مشکل ہے تو کسی دوسرے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کر لے تو بہت اچھا ہے۔ لیکن اگر شیخ جامع المعلومات ہو تو اُسی سے پوچھے۔ اگر شیخ کسی غیر شرعی کام کے لیے کہے تو اُس کام سے پرہیز کرے، ایسے کہ شیخ کو پتہ نہ چلے اور اگر پتہ چل بھی جائے تو مضائقہ نہیں۔ اگر جانے کہ شیخ اس (غیر شرعی) کام میں مشغول ہے تو بداعتقادی کا مظاہرہ نہ کرے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ شیخ نے طالب کے اعتقاد کا امتحان کرنے کے لیے ایسا ظاہر کر رکھا ہو۔ چاہیئے کہ ہر روز سلوک والوں کی چند حکایات کا مطالعہ کرے یا کسی دوسرے سے سُنے اور کسی ایک ہی لباس پہننے کو عادت نہ بنائے۔

اور چاہیئے کہ شیخ کا باطنی کردار اختیار کرے۔ بشرطیکہ معلوم ہو جائے اور مشکل بھی نہ ہو اگر شیخ کی خدمت (میں رہنا) نصیب ہو جائے تو خانہ کعبہ جانا ترک کر دے۔ بشرطیکہ اس پہ حج فرض نہ ہو۔ روزی کمانے کے لیے کام کاج کو نہ چھوڑے۔ اگر روزہ کی حالت میں کمانا مشکل ہو تو ہر مہینے میں تین دن اور رمضان مبارک کے علاوہ روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ چاہیئے کہ پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا کرے اور جب بھی کھانے بیٹھے، ابھی کچھ بھوک باقی ہو تو اُٹھ کھڑا ہو۔ لیکن ضرورت سے زیادہ (کام) نہ کرے۔ اگر بیوی بچوں والا ہو تو ایک سال کی خوراک بے شک جمع کر لے یہ کوئی حرج کی بات نہیں۔ اگر اکیلا ہے تو چالیس دن کی خوراک جمع کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان دونوں مقداروں کو پورا کرے تو کوئی حرج نہیں۔ چاہیئے کہ تکمیل کی کوشش نہ کرے جس عمل میں اُسے لذت ملے اسی کا ارادہ کرے مہمان نوازی میں حد سے زیادہ نہ لگا رہے۔ اگر شیخ فرمائے کہ اشعار وغیرہ پڑھو تو پڑھ دے۔ بازار میں زیادہ نہ پھرے۔ موت کو اکثر یاد کرے۔ اگر شیخ اپنے مذہب سے پھر جائے تو یہ نہ پھرے اور شیخ سے بدگمانی نہ کرے۔ اہل حق کی کتابوں کا زیادہ مطالعہ نہ کرے

تاکہ اعمال میں پیچھے نہ رہ جائے اور بڑی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔ اگر سمجھے کہ کتابیں پڑھنے سے عمل میں پیچھے نہیں رہوں گا تو بے شک مطالعہ کرتا رہے۔ والدین کے حقوق ادا کرے اور ہنسی مذاق سے دور رہے۔ خوبصورت (نامحرم) عورت پر نظر نہ کرے اور نوجوان لڑکوں پر نظر نہ کرے۔ اگر کسی وقت ایسا ہو جائے تو استغفار کرے۔ شیخ کے تصوّر کو اپنے دل میں لائے۔ اگر شیخ کسی عورت یا کسی مرد کے عشق میں گرفتار ہو جائے تو یہ گرفتار نہ ہو، نیز بدگمانی نہ کرے بلکہ یہ سمجھے کہ شیخ کے اس ظاہر میں بھی کوئی بھید ہے۔ اپنے آپ کو بزرگ ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اپنے آپ کو کسی خاص قِسم کے کھانوں کا عادی نہ بنائے۔ اولاً تو کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کرے اور اگر کوئی دوسرا لڑے تو یہ نہ لڑے۔ تین بار سے زیادہ لڑائی کو چھوڑ دے۔ اس سے دوسرا (لڑائی سے) باز آجائے گا۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو اپنے مدمقابل کے ساتھ اس قدر سختی سے پیش آئے کہ وہ لڑائی سے باز آجائے۔ اگر وہ باز نہ آئے تو خود اس سے بالکل بچنے کی کوشش کرے۔ اپنے گناہوں کا کسی سے تذکرہ نہ کرے۔ بہت زیادہ نہ گائے اور ہر ممکن کوشش کرے کہ شیخ کے جوتے اس کے سوا کوئی نہ اٹھائے۔ اس بات پر نظر رکھے کہ اس کا مقصد جلد حاصل ہو۔ اگر آج نہ ہو تو دوسرے روز پورا ہو گا۔ پس نیک اعمال کرے۔ اسے جاننا چاہیئے کہ کونسا عمل کروں جس سے جلد مقصد حاصل ہو جائے۔ دینی کاموں میں شیخ کے فرمان کو پورا کرنے میں سُستی نہ کرے۔ اگر شیخ کسی غیر شرعی بات کا حکم کرے اور یہ اس پر عمل کرے تو مضائقہ نہیں لیکن شیخ پر سے اعتقاد اٹھالے اور کسی دنیاوی چیز کے مِل جانے سے خوش نہ ہو اور اگر کوئی دنیاوی چیز ہاتھ سے نکل جائے تو غمگین نہ ہو۔ بہت زیادہ نہ کھائے۔ جنّوں اور ستاروں کو تسخیر کرنے کی کوشش نہ کرے بھی کوشش نہ کرے کہ میں امام یا پیشوا بن جاؤں اور ہر روز گوشت نہ کھائے، اسی طرح حلوہ وغیرہ بھی ہر روز نہ کھائے۔ اپنے لیے کوئی خوبصورت جگہ مقرر نہ کرے۔

راستہ چلتے وقت زیادہ دائیں بائیں نہ دیکھے اور سنبھل کر پاؤں رکھے۔ راستے میں جہاں کوئی بات خلاف شرع نظر آئے، دل سے اس کا انکار کرے۔ اگر شیخ (کبھی) اس سے ناراض ہو تو محسوس نہ کرے اور اگر (کبھی) تعریف کرے تو (حد سے زیادہ) خوش نہ ہو۔ جب بھی (شیخ) اُس کی عزت یا توہین کرے تو اُسے دل میں نہ لائے کیونکہ (طالب تو) خود عاشق ہوتا ہے اور شیخ معشوق اور معشوق کبھی تعریف کیا کرتا ہے اور کبھی تحقیر۔ ایسے میں عاشق خدمت کے سوا کسی چیز سے سروکار نہ رکھے۔

بیت :-

اے دوست اگر تو طالب ہے تو خدمت میں ثابت قدم رہ

کیونکہ عاشق اپنے معشوق کی دل سے خدمت کیا کرتا ہے

اگر شیخ اپنے سجادہ پر بیٹھنے کو کہے تو پہلے عذر پیش کرے (پھر بھی شیخ کہے) تو بیٹھ جائے اور اپنے دل میں (اس بات پر) مغرور نہ ہو۔ لوگوں کے سامنے اپنے شیخ کی باتیں زیادہ نہ کرے کیونکہ ممکن ہے لوگ اس کا مذاق اڑائیں۔ سحر اور جادو کو بالکل چھوڑ دے اور زیادہ تعویذ گنڈا نہ کرے۔ اگر کبھی کبھی کوئی آکر تعویذ مانگے تو بیشک دے دے۔ پانی وغیرہ دم کرنے میں بھی یہی وطیرہ رکھے۔ اگر کوئی تعویذ مانگے تو تین بار "اللہ" کا نام اس طرح (اللہ اللہ اللہ) لکھ کر دے دے جو حاجت بھی ہو گی پوری ہو جائے گی۔ جب (تعویذ) دے تو سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کرے اور پھر دے۔" جو بھی حاجت ہو اگر (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) کے آخر میں "الحمد" کے ساتھ ملا کر (الرحیمِ الحمد للہ) دم کرے یا تین بار "الرحمٰن الرحیم" کہے اور تین بار "آمین" کہے تو بہت اچھا ہے۔ اگر کوئی دوسری چیز پڑھ کر (دم کرے اور) دے تو بھی اچھا ہے۔ اس طرح ہر تعویذ کے بارے میں۔ اگر کسی فقیر کو کچھ دے تو اس کا احسان جانے اور بغیر کسی زیر باری کے جو کچھ دے سکے دے۔ اگر نہ دے سکے تو (سائل کو) اچھے طریقے

سے جواب دے۔ اگر سائل کوئی بات کہے تو اُسے غور سے سنے۔ اگر شیخ کو خواب میں دیکھے کہ یہ خدا ہے تو جانے کہ خدا کی صفات کا مظہر ہے اور مجھے اِس مظہر سے فائدہ پہنچے گا اور شیخ کی کرامات پر بھی غور کرے۔ کیمیا اور سیمیا وغیرہ کی طلب نہ کرے۔ اپنے ماضی و مستقبل کا غم نہ کھائے۔ اس بات کی کوشش کرے کہ ہماری طرح کوئی دوسرا طالب، شیخ کا عاشق نہ ہو اور (محبت شیخ میں) مَیں سب سے بڑھ جاؤں۔

صبح بیدار ہوتے وقت جس چیز کا خیال گذرے، سمجھے کہ میں اُسی کا خواہش مند ہوں۔ اگر وہ چیز مطلوب ہو تو شکر کرے اور اگر مطلوب نہ ہو تو استغفار کرے۔ حق تعالےٰ کی طلب میں ہر قسم کی نیکی کرے۔ اگر اپنا مقصد حاصل کرلے تو اسے کم نہ جانے۔ اس بات کی کوشش نہ کرے کہ اس کی ترقی نہ ہو بلکہ اپنے عزم کو راسخ رکھے۔ صلہ رحم کرنے میں حد سے نہ گذر جائے ورنہ اپنے مقصد کو نہ پاسکے گا۔ لیکن صلہ رحمی کو بالکل بھی ترک نہ کرے۔ شیخ کے سجادہ پر یعنی صدر مجلس میں اپنے آپ نہ بیٹھے اور شیخ کے سامنے آئے تو نہایت احترام سے آئے اور شیخ کے خادموں کا بھی لحاظ رکھے۔ بشرطیکہ کوئی حرج نہ ہو۔ اگر کبھی بیمار پڑ جائے تو ہائے پکار نہ کرے۔ لوگوں کے لیے خواہ مخواہ نہ بچھا جائے۔ لیکن اگر غیر ارادی طور پر اپنی عاجزی کا اظہار کر بیٹھے تو کوئی حرج نہیں۔ اس بات کی کوشش نہ کرے کہ غیبی مخلوق یعنی جنات وغیرہ سے ملاقات ہو۔ اگر ہو جائے تو ٹھیک ورنہ خیر۔ اگر بہت سے لوگ اُسے ملنے آئیں تو اسے مصیبت سمجھے اور اگر کوئی اُسے ملنے نہ آئے تو اسے فخر سمجھے۔ لوگوں پر نکتہ چینی سے پرہیز کرے۔ سوائے تین مقامات کے۔ سُنی سنائی باتوں پر یقین نہ کرے، شیخ کے بارے میں زبان سے بھی اقرار کرے اور دل سے بھی تصدیق کرے۔ کسی کے غم یا خوشی کو دیکھ کر ضرورت سے زیادہ متاثر نہ ہو۔ اگر قرآن حفظ کیا ہو تو (ہر روز) کچھ پڑھے تاکہ بھول نہ جائے۔ اگر زیادہ پڑھے تو زیادہ اچھا ہے۔ اگر (خوب) یاد ہو تو چالیس دن میں ختم کرے۔ اس سے نقصان نہیں ہوگا اگر اس سے بھی جلد ختم کرلے تو بہت اچھا ہے۔ چاہیئے کہ بہت زیادہ تکیہ لگا کر نہ

بیٹھے سوائے اس کے کہ ضرورت ہو، لیکن شیخ کی موجودگی میں تکیہ لگا کر بیٹھنے سے پرہیز کرے
اس بات کی کوشش نہ کرے کہ اکثر دنیا والوں کی صحبت میسر رہے بلکہ یہ کوشش کرے کہ
خلوت وجلوت میں اس کی عبادت برابر ہو اور (خواب میں) رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم
یا اپنے شیخ کی زیارت ہو جانے سے یہ سمجھے کہ شیخ کی اس پہ توجہ ہے۔ اگر اُس شیخ کو جس
سے یہ چاہتا ہے کہ فیض حاصل کرے، خواب میں دیکھے تو اُس کا بھی وہی مطلب ہو گا۔
اپنے شیخ کے علاوہ کسی کے سامنے نہ ہو۔ شیخ کو چاہیئے کہ جو طالب ذہنی طور پہ بالغ نہ ہُوا
ہو اُسے کسی قسم کی تلقین نہ کرے اور زیادہ توجہ نہ کرے۔ سماع سننے کی بھی کوشش کرے
اور سماع سننے کا طریقہ حضرت شیخ نصیر الدین کے رسالہ (اوراد) کی شرح میں درج کیا گیا
ہے۔ اگر سماع نہ سنے تو اسے حرام نہ کہے۔ اس مسئلہ میں اختلاف رائے ہے۔ شیخ کی
موجودگی میں کمانا ممکن نہیں۔ اگر شیخ اجازت دے تو کماؤ ورنہ نہ۔ اگر شیخ اپنے شیخ المشائخ
کی طرف سے توجہ فرمائے تو زہے سعادت، جب شیخ کی قبر کی زیارت کو جائے تو نزدیک
پہنچ کر نہ زیادہ تیز چلے اور نہ زیادہ آہستہ بلکہ درمیانی رفتار سے چلے۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو
(شیخ کے مزار کا) طواف کرے۔ نہ کر سکے تو کوئی بات نہیں۔ جب طواف کرے تو تکبیر پڑھے
اور فاتحہ پڑھنے کے بعد کہے "یا حضرت شیخ مدد کیجئے کہ فلاں آدمی ہمارے حلقہ میں آجائے"
اور اپنے شیخ کا نام لے یا وہ نام جس کا شیخ نے حکم کیا ہو یا اُس شیخ کا نام لے جس سے یہ
فیض حاصل کرنا چاہتا ہے۔ فاتحہ پڑھتے وقت، قبلہ کی جانب پشت کرے اور منہ شیخ
کی طرف۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو اس کے بعد قبر کو بوسہ دے اور رخسار کو مَلے یا ہاتھ کو قبر
پر مَل کر بوسہ دے یا اپنے سر پہ مَلے اور واپس ہوتے وقت تین قدم الٹے پاؤں چلے،
اس کے بعد ان کی طرف پشت کرے اور فاتحہ اگر اس طرح پڑھے تو اچھا ہے۔ یعنی پہلے
درود شریف پڑھے پھر الحمد شریف پھر آیت الکرسی تین بار، پھر سات مرتبہ الھٰکم التکاثر
پھر گیارہ مرتبہ سورہ اخلاص اور آخر میں پھر درود شریف۔ اگر یوں پڑھے تو حرج نہیں

اور طواف بھی لازم نہیں۔ اگر کر سکے کرے نہ کر سکے نہ کرے۔ (شیخ کے مزار سے) واپس آنے کے مذکورہ طریقے کی ہمیشہ پابندی کرے۔ اگر (کسی وقت) سہواً یا کسی ضرورت سے ایسا نہ کر سکے تو حرج نہیں۔ جب شیخ کے مزار کی زیارت کرے یا ایسے شخص کی قبر پہ جائے جسے شیخ نے اس طالب کی طرف توجہ کا حکم دیا تھا یا کسی ایسے بزرگ کی قبر پر حاضری دے جس سے یہ فیض حاصل کرنا چاہتا ہے، چاہیئے کہ اپنا مقصد عرض کرے اور اُن (کے واسطے) سے مدد مانگے۔ البتہ مدد آہستہ آہستہ مانگے۔ اور فاتحہ پڑھتے وقت دائیں بائیں بھی دیکھے چاہیئے کہ کسی بزرگ کے سامنے بغیر اجازت کے کسی دوسری چیز میں مشغول نہ ہو۔ کیونکہ ان کی عدم موجودگی میں ایسا کرنا کوئی مشکل تھوڑا ہی ہے۔ جتنا ممکن ہو پاسِ انفاس[1] بھی کرے۔ یعنی آنکھیں اور منہ بند کر کے سانس کو دل سے گزارے۔ جب سانس باہر آئے تو تصور کرے کہ یہ کلمہ "الا اللہ" کے ساتھ اندر جائے گا۔ اس بات پر یقین ہو کہ لا معبود الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) اور لا مقصود الا اللہ (اس کے سوا کوئی مقصود نہیں) اور لا موجود الا اللہ (اس کے سوا کوئی موجود نہیں)، اس کے بعد قرآن شریف (ہاتھ میں) لے۔ آواز سے پڑھے یا دل میں چاہیئے کہ واعبد ربک کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک[2] (خدائے تعالےٰ کی عبادت اس طرح کر، جیسے تم اس کو

---

[1] "پاسِ انفاس" ایک ذکر کا نام ہے جو مشائخ کرام طالب کو کراتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ سانس باہر نکالتے وقت "لا الٰہ" اور اندر لیتے وقت "الا اللہ" بغیر زبان ہلائے اور منہ بند کر کے کہتے ہیں۔ جب طالب کو اس کی خوب مشق ہو جائے تو مراقبہ وغیرہ بتاتے ہیں۔ یہ ذکر صوفیائے برصغیر کے ہاں زیادہ رائج ہے۔ (مستفاد از ضیاء القلوب ص ۱۲؛ قول الجمیل ص ۵۶، ۶۸)

[2] صحیح بخاری کتاب الایمان (۳۷) بخاری شریف میں اس کے الفاظ مختلف آئے ہیں۔

دیکھ رہے ہو یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو تصور کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے) والی حدیث شریف پہ عمل کو اپنے اوپر لازم ٹھہرائے۔ کتابوں میں جہاں کہیں "ممکن" کا لفظ آئے اس سے مراد "بغیر حرج" کے ہوتا ہے۔ اپنی طاقت کے مطابق اور بغیر کسی نقصان کے مشائخ کے عرس بھی کرے اور اگر عرس کا ہمیشہ اہتمام کرنا چاہے تو اپنے شیخ سے (زندہ ہو تو) خود حاضر ہو کر یا (وصال ہو چکا ہو تو) باطنی طور پہ اجازت لے تو زیادہ اچھا ہے۔ اگر کسی کو کچھ (راہ للہ) دینا ہو تو اتنا ہی دے جو اپنے بیوی بچوں اور ملازمین کو دیتا ہو اور جو کچھ خود کھاتا ہو اسی کے مقدار دوسروں کو کھلانے کی نیت کرے۔ اگر عرس کے لیے دن (مقرر) کرنا مشکل ہو تو جس دن بھی آسانی سے کرسکتا ہو عرس منائے، عرس پر خرچ کرنے میں تکلف نہ کرے جو بغیر تکلف کے خرچ کر سکے کرے۔

اے طالب حق اور اے عزیز اور اے محبوب تجھے چاہیئے کہ اولیاء اللہ کے عرسوں کا انتظام و انصرام بھی (اسی نیت) کرے۔ تاکہ ان کی مدد اور راہنمائی سے ایسی استعداد پیدا ہو کہ اللہ تعالےٰ ان کے طفیل اور اپنے کرم (خاص) سے نیک کاموں کی توفیق عطا فرمائے اور دونوں جہان میں عزت بخشے۔

جب وہ ضیافت کے اہتمام کا ارادہ کرے تو اسے چاہیئے کہ وہ اس کے یوم وفات کو معلوم کرنے کی پوری کوشش کرے اور لمحہ کے بارے میں بھی احتیاط برتے جس آن ان کی روح نے پرواز کی۔

پس چاہیئے کہ اسی گھڑی میں کھایا پیا جائے۔ کیونکہ اس سے ان کی روحیں مسرور ہوتی ہیں۔ ایسا کرنے میں بڑی گہری تاثیر ہے۔ پس جب وہ کھانے پینے کی چیزوں میں سے کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو ان کی روحیں خوش ہوتی ہیں۔ اور دعا کرتی ہیں اور (ان کے لیے) بددعا نہیں کرتیں۔

اگر طالب کے لیے عرس کے مقام پہ جانے میں دشواری ہو تو اس کی ضرورت

نہیں ۔ جہاں بھی وہ ہو، اپنی استطاعت کے مطابق عرس منالے ۔ اگر (شیخ کے وصال کی) گھڑی ٹھیک معلوم نہ ہو، صرف اتنا معلوم ہو کہ ان کا وصال دن میں ہوا ہے تو دن میں عرس منائے ۔ اگر رات کے وقت (وصال) ہوا ہے تو رات کو منائے ۔ صاحبِ راز حضرت گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ، رمضان المبارک کی اٹھارہویں تاریخ کو حضرت قطب الاقطابؒ کی روح (کو ایصالِ ثواب) کے لیے بہت خرچ کیا کرتے تھے ۔ کیونکہ ان کا وصال رات کے وقت ہوا تھا ۔ البتہ دن میں بھی (بہت خرچ) کرتے تھے ۔ اگر یقین کے ساتھ معلوم نہ ہو کہ (شیخ کا) وصال دن میں ہوا ہے کہ رات میں، تو دن اور رات دونوں میں عرس کرے تین دن اور دو رات عرس پر خرچ کرکے اگر اگلی رات اور دن میں بھی خرچ کرنے کی نیت کرے گا تو وہ عرس کے دن خرچ کرنے کے مترادف ہوگا ۔ اگر دن رات دونوں کے بارے میں معلوم نہ ہو تو اُس مہینے میں (عرس) کرے ۔ اگر مہینہ بھی معلوم نہ ہو تو رجب کے مہینے میں کرے ۔ خصوصاً شبِ رغایب[1] میں یا اس سے اگلے روز اگر کوئی رغایب کی رات یا دن میں، حسبِ استطاعت، اور بغیر کسی جرح کے، تمام انبیاء (علیہم السلام) اور اہلِ ایمان حضرات کی ارواحِ مبارکہ (کو ایصالِ ثواب) کے لیے معراج کی رات یا دن میں خرچ کرے تو اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوگی ۔ یہ سب اس کے لیے مددگار ہوں گے ۔ اگر کوئی مفلس ہو تو جو کچھ گھر میں کھانے پینے کو موجود ہو، اُسی پر انبیاء و اولیاءؒ کی ارواح کو ثواب پہنچانے کی نیت کرکے خود ہی کھالے ۔ اگر اُس روز فاقہ ہو جب بھی ان حضرات پر فاتحہ پڑھنا نہ بھولے ۔ اے خدائے تعالٰے کے طالب، شاگردانِ کامل، مریدانِ صادق

---

[1] ۔ رغبتوں والی رات ۔ رغبت، صوفیا کی اصطلاح میں محب کے محبوب کی جانب توجہ اور میلان کو کہتے ہیں ۔ چونکہ شبِ معراج میں اللہ تعالٰے نے حضور صلعم (اپنے محبوب) کو خود بلایا تھا ۔ اس لیے اسے لیلۃ الرغائب کہا جاتا ہے ۔

(مستفاد از فرہنگ علوم عقلی صہ ۲۷۷)

اور معتقدانِ واثق کو چاہیئے کہ اپنے پیروں، شیخوں اور مرشدوں کی روحوں کو ثواب پہنچانے کے لیے اپنی توفیق کے مطابق کھانا تقسیم کیا کریں۔ اگر سارے عُرسوں کو نہ منا سکیں تو بعض کو ضرور منائیں تاکہ ان کی برکت سے شرح صدر اور دونوں جہانوں کی دوسری (روحانی) نعمتیں زیادہ ہوں اور ان کے مال اور عمروں میں برکت آئے اور ان کی مرادیں پوری ہوں اور انہیں کسی مخلوق کے سامنے سوال نہ کرنا پڑے اور (اعمال کا) عزم اور (ایمان کی) دولت زیادہ ہو اور اُن حضرات کی برکت سے (روزِ قیامت) آدمی اس کے ساتھ ہوگا، جس سے محبت کرتا ہے۔) کے مطابق ـــــــ اس کی عاقبت بخیر ہو جائے، انشاء اللہ تعالےٰ۔ اور یہ بات تجربے سے ثابت ہو گئی ہے کہ دونوں جہانوں میں سعادت مندوں اور اغنیاء کے سوا، ایسے کاموں کی توفیق و سعادت کسی کو نہیں ملا کرتی۔ اس رسالے میں جو کچھ درج ہے (اِس نیت سے لکھا گیا) کہ ممکن ہے بہت سے لوگ اس پر عمل کر کے سعادتِ دارین حاصل کر سکیں۔

تمت

ہدایت الطالبین (؟) ملفوظاتِ حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی
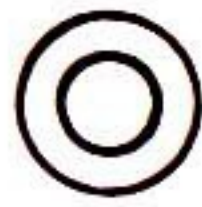
بسم اللہ الرحمن الرحیم

رفیق الطلاب

سب تعریف اُس خالق کے لیے کہ صرف اُسی کی ذات تعریف کے لائق ہے اور تمام مخلوق اُسی کی ثنا گو ہے اور بے انتہا درود اُس محبوب خدا کے لیے جو ذاتِ خداوندی کا مکمل مظہر ہیں۔ خدائے واحد کا خصوصی فضل اُن پر ہے۔ احمد و محمد انہی کا نام مبارک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ مہاجر اور انصار میں سے سارے برگزیدہ حضرات پہ بھی درود ہو خصوصاً صحابۂ کرام میں سے افضل حضرت ابی بکر بن ابی قحافہ پہ اور رئیس اصحاب حضرت عمر بن الخطاب پہ اور جامع القرآن حضرت عثمان بن عفان پہ اور شیرِ خدا حضرت علی ابن ابی طالب پہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور اُن پہ جنہوں نے افراط و تفریط کے بغیر اُن کی اتباع کی، خصوصاً قطب الاقطاب، خدا کے مقرب، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وارث، شیخ نصیر الدین محمود اودھی چراغ دہلی، جن پہ خدائے تعالےٰ اپنے ظاہری و باطنی انوارات کی بارش کرے۔ بیت

وہ بلند مقام والا جو قوم و ملک و دین کی مدد کرنے والا ہے۔ خدا کے بعد "نعم النصیر" (کتنا اچھا مدد کرنے والا ہے۔) کا لقب اُنہی کو سجتا ہے۔ ہمارے والد، مرشد و مربّی نصیر الدین ثانی، عالم و عابد، اصول و فروع اور معقول و منقول کے جاننے والے، شاہ و گدا پہ رحم کھانے والے، اولیاء و اتقیاء کے سردار، حضرت شیخ صالح محمد...... جو اپنے

حقیقی خالو شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی سے فیض یافتہ تھے۔ اس کے بعد غریب و مسکین شیخ محمد بن شیخ حسن محمد کہتا ہے۔ کہ خدا تمہیں دنیا و آخرت کی سعادتیں بخشے اور تمہیں اپنی ہستی کی فنا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بقا نصیب فرمائے۔ یہ رسالہ ہے جس کا نام "رفیق الطلاب" ہے اور یہ رب الارباب کی طرف کھینچ کر لانے والا ہے۔

فصلِ اوّل

تجھے چاہیئے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامل اتباع کرے تاکہ خدا تعالیٰ تجھے محبوب رکھے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تحبون اللہ فَاتبعونی یحببکم اللہ (آلِ عمران ۳ : ۳۱) (کہہ دے اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر اللہ کی محبت حاصل کرنا چاہتے ہو تو میری کامل اتباع کرو۔) پس تمہیں لمحہ بہ لمحہ توبہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ قرآن شریف کے مطابق "اِنّ اللہ یحب التوابین ویحب المتطہرین[1]" (بقرہ ۲ : ۲۲۰) اسی طرح حدیث نبوی ہے۔ "التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ[2]" (توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔) اپنا محاسبہ بالکل نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ محاسبے کے دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ اپنے قول و فعل اور حرکت و سکون میں سے جو بھی خلافِ شرع واقع ہوا ہو اُس سے توبہ کی جائے۔ اس طرح کہ دوبارہ ان افعال و اقوال کے قریب نہ پھٹکے۔ اگر پھر کوئی ایسا فعل سرزد ہو جائے تو توبہ کرلے۔ یہاں تک کہ نفس مطیع ہو جائے۔ نیز کھانا پینا ایسی طرح سے کم کر دے کہ نیند کم آئے۔ البتہ قوت باقی رہے اور بدن کمزور و لاغر نہ ہو۔ اگر چند روز تک کھانا نہ کھانے سے بدن کی قوت

---

[1] :- اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

[2] :- ابنِ ماجہ، کتاب الزہد (۳۰)

بدستور باقی رہے توزہے نصیب، ورنہ کھانا کھائے۔ اگر بالکل نہ چھوڑ سکتا ہو تو پانی پینا کم ضرور کر دے۔ روغنی اور چکنائی والی اشیاء کھانے سے پرہیز کرے۔ اگر حیوانی گھی نہ کھائے تو نباتاتی کھائے تاکہ دماغ خشک نہ ہو، خوشبو دار اشیاء سونگھا کرے۔ سر میں تیل ڈلوائے تاکہ دماغ تر رہے۔ جب اس طریقے کی اللہ تعالیٰ سے توفیق مل جائے تو دوسرا اختیار کرے۔ دوسرا طریقہ باطنی توبہ کا ہے کہ دل میں کسی قسم کے خطرے کو نہ آنے دے۔ خطرات چار قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلا خطرہ نفسانی، دوسرا خطرہ شیطانی تیسرا خطرہ ملکی اور چوتھا خطرہ رحمانی۔

جب طالب اپنے دل میں دنیا کی شہوتوں اور لذتوں کی خواہش پائے تو جانے کہ یہ خطرہ نفسانی ہے جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے۔ "وما ابری نفسی اِنّ النفس لامّارۃ بالسوء"[1] (سورہ یوسف ۱۲: ۵۳)

لہٰذا اِن (خواہشات) کو دل سے نکالے۔ اس کے بعد جب اپنے دل میں لایعنی مکروہ اور حرام چیزوں کی محبت دیکھے تو سمجھے کہ یہ خطرہ شیطانی ہے۔ جسے آیتِ قرآنی "قال فبعزتک لاغوینھم اجمعین"[2] (ص ۳۸: ۸۲) ظاہر کرتی ہے، اس لیے اِسے بھی دور کرے۔ اس کے بعد جب اپنے دل میں عبادات، نیکیوں اور کارہائے خیر کی خواہش دیکھے تو سمجھے کہ یہ خطرہ مَلَکی (فرشتوں جیسا) ہے۔ جس کے بارے میں قرآن کے یہ الفاظ "یسبّحون الیل والنھار لایفترون"[3]

(انبیاء ۲۱: ۲۰)

لہٰذا (اگر کوئی فخر و غرور دل میں آرہا ہو تو) اُسے دل سے نکالے۔ اس کے بعد

---

[1] اور میں اپنے نفس کو اس سے بَری نہیں سمجھتا، کیونکہ نفس تو بُری ہی بات سمجھاتا ہے۔

[2] (کہا شیطان نے) کہ تیری عزت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کروں گا۔

[3] شب و روز اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور کسی وقت اس سے غافل نہیں رہتے۔

جب دل میں عالم آخرت (اپنی عاقبت) کو جاننے کا شوق پیدا ہو تو سمجھے کہ یہ خطرہ رحمانی ہے جس کی (یہ حدیث) "(کنت کنزاً مخفیاً) فاحببت أن اعرف (فخلقت خلقاً فعرّفتهم بي فعرفوني)"[1] یعنی میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں (اس لیے میں نے کائنات کو پیدا کیا) میں نے اُن سے اپنا تعارف کرایا۔ پس انہوں نے میری معرفت حاصل کر لی۔ تائید کرتی ہے۔ پس اُسے بھی اپنے دل سے دور کرے۔ اور خدا تعالیٰ کی محبت میں اس قدر منہمک ہو کہ اپنی عبادت اور عاقبت کی آگاہی، نظر میں نہ جچے۔ یعنی عبادات اور عرفانِ عاقبت میں حد درجہ انہماک تو پیدا کرے لیکن اُن پر اتنا خوش نہ ہو کہ اچھے لگنے لگیں۔ لہٰذا ان کا خیال بھی دل سے نکالے۔ اگرچہ یہ کام بہت مشکل ہے۔ ان تمام خطرات کو دور کرنا خدائے تعالیٰ کی رضا اور توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ پس چاہیئے کہ خدا کی رضا طلب کرے نہ کہ بہشت یا دوزخ یا دنیا۔ خدا کی رضا کے سوا کسی کا طالب نہ ہو۔ طمع و حرص کو بھی چھوڑ دے اور صرف خدا کی رضا طلب کرے۔ اگر رضائے خدا حاصل ہو گئی تو گویا خدا کا محبوب بن گیا، جس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامل اتباع نصیب ہو گی۔ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم فرمایا کرتے تھے: "انی رایت رجلاً من امتی فی لیلة المعراج یریهم (؟) الله فی مقامی"[2] یعنی میں نے معراج کی رات اپنی اُمت کے ایک شخص کو دیکھا جسے اللہ تعالےٰ (لوگوں کو) میرے مقام پر دکھا رہا تھا۔

---

[1]: موضوعات کبیر از ملا علی قاری، بیروت ۱۹۷۱ء ص ۲۷۳ کتبِ حدیث میں یہ حدیث نہیں ملتی۔ صرف صوفیاء کے ہاں ملتی ہے۔ مثلاً مثنوی مولانا روم (درک مرآۃ المثنوی ص ۹۲۳

[2]: کتب مراجعہ میں یہ حدیث نہیں مل سکی۔ مطبوعہ نسخے میں اس حدیث کے آخری کلمات واضح نہیں ہیں۔ ممکنہ صحیح ترجمہ قرین قیاس ہے۔

شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی نے اپنے رسالہ "مراۃ المومنین"[1] میں لکھا ہے کہ مومنین اسکو آخرت میں اس طرح دیکھیں گے جیسے اولیاء اللہ اسے دنیا میں دیکھتے ہیں اور اولیاء اللہ اس کو آخرت میں اس طرح دیکھیں گے۔ جیسے انبیاء علیہم السلام اسے دنیا میں دیکھتے ہیں اور انبیاء کرام اُسے آخرت میں اس طرح دیکھیں گے۔ جیسے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسے دنیا میں دیکھتے ہیں اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو آخرت میں جس طرح دیکھیں گے وہ ان کا مقامِ محمود ہے۔ جس میں ان کے ساتھ اور کوئی شریک نہیں ہے۔ کاش کہ (آخرت میں) میں محمد علیہ السلام کی امت میں شمار ہو جاؤں کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے اے اللہ مجھے محمد احمد علیہ السلام کی امت میں کر دے۔

اے طالب جان لے کہ جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع کرے۔ اس کا (مقام) میں کیا بیان کروں۔ صرف وہی جانتا ہے جو رسول صلعم کی اتباع کرتا ہے......

اولیائی تحت قبائی لا یعرفھم غیری (حدیث)[2] (میرے اولیاء میری قبا کے نیچے ہیں۔ میرے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا)

دوسری فصل

اے طالب جان کہ پہلی فصل میں جو کچھ بیان ہوا ہے (ممکن ہے) وہ سمجھ میں نہ آئے۔ کیونکہ مشکل ہے۔ اُن باتوں پر تو صرف وہ یقین کر سکتا ہے جو ان کی معرفت رکھتا ہو اس لیے تجھے چاہیئے کہ (ان باتوں سے) پہلو تہی نہ کرے (ان پر یقین رکھے) اور جو کچھ

---

[1] ۔ ایضاح المکنون اور ھدیۃ العارفین جیسی کتب میں اس رسالے کا ذکر نہیں ملتا۔ حضرت سہروردیؒ نے ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء میں وفات پائی (ذیل ص ۳۶۰) البتہ حضرت سہروردی مقتول کو ۵۸۷ھ میں شہید کیا گیا۔

[2] :۔ یہ حدیث بھی کتب حدیث میں نہیں مل سکی۔ صوفیائے کرام ہی اسے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔

اس فصل میں بیان ہو رہا ہے اُس پر عمل کرے۔ اس کے بعد امید ہے کہ جو کچھ پہلی فصل میں ہے۔ اللہ تعالےٰ تجھے اُس پر یقین اور سمجھ عطا فرمائے گا۔ اے طالب! اصلی مقصد یعنی اختیاری موت، کو حاصل کرنا چاہیئے۔ ملکوت السماء[1] میں سے سب سے خوب صورت وہ ہے جس کی پیدائش دو دفعہ نہ ہوئی ہو۔ پہلی ولادت تو (سب کو) معلوم ہے۔ دوسری ولادت ایک ایسی چیز سے عبارت ہے جو اختیاری موت کے بعد (انسان پر) ظاہر ہوتی ہے۔ جب اختیاری موت حاصل ہو جاتی ہے۔ تو نہ کوئی کام مشکل رہتا ہے اور نہ راہِ مقصود میں مانع آتا ہے۔

بادشاہ ہو یا وزیر، قاضی ہو یا مفتی، تاجر ہو یا نوکر چاکر، طالب کو چاہیئے کہ پہلے وہ محاسبہ[2] حاصل کرے۔ (اپنے محاسبہ کے لیے سامان فراہم کرے) جس کے لیے چند چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ سب سے پہلے مرشدِ کامل، کیونکہ (مقصد تک) پہنچنا اس کے وسیلے سے ممکن ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے:

یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ[3] (مائدہ ۵: ۳۵)

مثلاً اگر چیونٹی چاہے کہ خانہ کعبہ کا طواف کرے تو وہ نہیں کر سکتی چاہے جتنی بھی کوشش

---

[1] :۔ ملکوت فرشتوں کا مقام عبادت ہے۔ ملکوت السماء سے مراد، عالم علوی ہے۔ جہاں کی ہر چیز پاکیزہ و منزہ ہے۔ (مستفاد از فرہنگ علوم عقلی، ص ۵۷۸)

[2] :۔ یہ اصطلاح آیت قرآنی "ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ" سے ماخوذ ہے۔ صوفیاء کے نزدیک طالب کو اپنے ہر ہر سانس کا حساب یعنی ہر لمحہ اپنا حساب لینا چاہیئے۔ اگر کوتاہی نظر آئے تو توبہ استغفار کرنی چاہیئے۔ جب تک یہ ممکن نہ ہو تو ہر رات کو سونے سے پیشتر ضرور اپنے سارے دن کے کاموں کا محاسبہ کرے۔ (مستفاد از فرہنگ علوم عقلی، ص ۵۲۹)

[3] :۔ اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے لیے کوئی وسیلہ تلاش کرو۔

کرے لیکن اگر کبوتر کے پاؤں پر بیٹھ جائے تو (باسانی) کر سکتی ہے۔ شیخ (برحق) کون ہے
وہ جس کا (کوئی) قول شریعت کے دائرے سے خارج نہ ہو اور جس کا کوئی فعل طریقت
کے دائرے سے باہر نہ ہو اور اس کے باطنی حالات، حقیقت والے ہوں۔ ایسے کسی
شخص کا ملنا البتہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا آدمی اپنے آپ کو چھپا کر رکھتا ہے۔ لہٰذا
ریاضت کرنی ہوگی۔ اگرچہ یہ ریاضت پہلی کی بہ نسبت کم ہوگی۔ کیونکہ ایسے شخص کے
مل جانے سے آخری ریاضت یہی ہوگی۔ جبکہ اِس کے بغیر پہلی اور آخری دونوں کرنی ہوگی
شیخ اور مرید کیا ہیں۔ مرید کے دل کا تعلق شیخ کے ساتھ۔ پس چاہیئے کہ دل کا تعلق شیخ کے
ساتھ ہو اور ریاضت کرے خواہ شیخ زندہ ہو یا اس کا وصال ہو چکا ہو۔ خواہ نزدیک ہو یا
دور۔ "واعبد ربک کانک تراہ"[1] (اپنے رب کی عبادت اس طرح کر جیسے وہ تجھے
دیکھ رہا ہے۔) یعنی اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو کہ جیسے وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اپنے
اعمال سے ثابت کر دے اور ترکِ دنیا کو تمام نیکیوں سے بڑھ کر سمجھے اور حُبِ دنیا کو
تمام برائیوں کی جڑ جانے۔

اللہ تعالےٰ کے فرمان "ولا تسرفوا انہ
لا یحب المسرفین"[2] (انعام ۶: ۱۴۱؛ اعراف ۷: ۳۱) کا بھی یہی مفہوم ہے۔
اور مال جمع کرنا اس کے منافی نہیں، اس لیے بعض صحابہ کرام اور بعض مشائخ عظام
نے بھی مال جمع کیا ہے اور ان کے بعد وارثوں نے اُسے تقسیم کیا ہے۔ جب بھی سوئے
سمجھے کہ (شاید) یہ میرا آخری سونا ہے۔ اس لیے توبہ کرے اور کلمۂ توحید، سورۂ فاتحہ، آیۃ کرسی

---

[1] :۔ بخاری شریف، کتاب الایمان (۳۷) بخاری شریف میں اس حدیث کے الفاظ
قدرے مختلف ہیں۔

[2] :۔ اور فضول خرچی نہ کرو۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند
نہیں کرتے۔

اخلاص، فلق اور والناس پڑھے اور شیخ نصیرالدین محمودؒ سے امداد مانگے۔ جب بیدار ہو تو پہلے کلمہ توحید پڑھے اور پھر یہ دعا پڑھے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا و الیہ النشور"[1] اور اس دعا کے اوّل و آخر میں درود شریف بھی پڑھے۔ جب بھی کوئی نیا کپڑا پہنے تو سمجھے کہ (شاید) یہ آخری کپڑا ہو اور جب بھی نماز کے لیے کھڑا ہو تو سمجھے کہ (شاید) یہ آخری نماز ہو۔ جب معلوم ہو جائے کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے تو تاخیر نہ کرے اور اوّل وقت میں با جماعت نماز پڑھے۔ اگر اوّل وقت میں جماعت میسر نہ آئے تو اذان و اقامت کہہ کر (اکیلا ہی) نماز پڑھ لے تا کہ فرشتے اس کی اقتدا میں نماز پڑھیں۔ اس طرح جماعت کا ثواب مل جائے گا اور اللہ کی رضا حاصل ہو گی۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو مکروہ وقت نہ ہونے دے۔ عورت کو البتہ جماعت کی ضرورت نہیں۔ پانچوں وقت نماز کے بعد تینتیس بار سبحان اللہ، تینتیس بار الحمد للہ اور چونتیس مرتبہ اللہ اکبر پڑھے۔ دس بار سورہ اخلاص، دس بار درود شریف پڑھے، اس کے بعد دو رکعت سنت عشا پڑھے اور ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد دس بار سورہ اخلاص پڑھے اور سلام پھیرنے کے بعد ستر بار "یا وھاب" کہے۔ حق تعالےٰ اُسے دنیا میں کسی کا محتاج نہ کریں گے۔ نیز اگر توفیق ملے تو مغرب کی (دو) رکعت سُنت کے بعد چھ رکعت (دو دو کر کے) اوّابین بھی پڑھے اور ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد تین بار سورہ اخلاص پڑھے تا کہ ثواب زیادہ ملے۔ جو کوئی ہمیشہ یہ نماز (اوّابین) پڑھتا رہے۔ اس کی توبہ قائم رہے گی۔ پھر ایک دو رکعت ایمان کی حفاظت کے لیے پڑھے اور ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سات مرتبہ اخلاص اور ایک ایک بار تعوذ بھی پڑھے۔ سلام پھیرنے کے بعد سر سجدہ میں رکھ کر "یا حیّ یا قیوم ثبتنی علی الایمان"

---

[1]:۔ بخاری شریف، کتاب الدعوات۔ ۲۳۸۲

[2]:۔ بخاری شریف، کتاب الایمان (۳۷)

(اے ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والے مجھے ایمان پر ثابت قدم رکھ) تین بار کہے۔

جب بھی روزہ رکھے تو سمجھے کہ (شاید) یہ اس کا آخری روزہ ہو اور کان، آنکھ زبان، ہاتھ اور پاؤں کو برائی سے محفوظ رکھے۔ یعنی دن میں کسی قسم کی برائی نہ کرے اور " واعبد ربک کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک[1] " والی حدیث پر یقین رکھے اور اس حدیث پر ظاہراً بھی عمل کرے تاکہ حدیث کے باطنی معنی پر بھی توفیق حاصل ہو اور شرح لمعات[2] میں کہا جا چکا ہے کہ دنیاوی زندگی کی مثال روزہ کے دن کی طرح ہے۔ (الدنیا یوم ولی فیہا صوم) یعنی دنیا (کی زندگی) ایک دن کی مانند ہے اور میں اس میں روزے سے ہوں۔ جہاں تک ممکن ہو سکے اور بغیر کسی نقصان کے ایثار (غریبوں، مسکینوں اور راہِ خدا میں خرچ) کرے اور " ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطہا کل البسط فتقعد ملوماً محسوراً[3] " (اسرائیل ۱۷ : ۲۹) کے مطابق تصور کرے کہ اس کا مجھ پر احسان ہے نہ کہ میرا اس پر، کیونکہ اس کے سبب اللہ تعالیٰ نے مجھے (اجر و ثواب دے کر) اونچے مرتبے پر فائز کرے گا۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے۔

" الذین ینفقون اموالہم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضاعف لمن یشاء

---

[1] :- بخاری شریف، کتاب الایمان (۳۷)

[2] :- فخر الدین عراقی (متوفی ۶۸۶ھ) کی مشہور کتاب کی شرح جو عموماً اشعۃ اللمعات کے نام سے مشہور ہے جسے جامی (۸۹۸ھ) نے ۸۸۶ھ میں لکھا لیکن یہاں نعمت اللہ ولی (۸۳۴ھ) کی شرح کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ (فہرست مخطوطات فارسی از ایتھے شمارہ ۱۳۵، ۱۲۹)

[3] :- یعنی اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا نہ رکھ اور نہ اتنا زیادہ کھول کر پھر الزام زدہ اور ہارا ہوا بیٹھا پڑے۔ یعنی میانہ روی اختیار کر۔

ان اللہ لاینظر الی صورکم ولا الی اعمالکم ولکن ینظر الی قلوبکم ونیاتکم (حدیث شریف [1]) یعنی خدا تعالےٰ تمہاری شکلوں کو اور اعمال کو نہیں دیکھتے ہیں بلکہ تمہارے دلوں کو اور نیتوں کو دیکھتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالےٰ تمہاری ظاہری صورتوں کو نہیں دیکھتے نہ تمہارے ظاہری اعمال کو دیکھتے ہیں۔ لیکن تمہارے باطنی اعمال اور صورتوں کو دیکھتے ہیں۔ جن کا تعلق صرف تمہارے دلوں کی صالحیت سے ہے۔ چنانچہ ناگزیر ہے کہ تم ان کی اصلاح کرو اور انہیں لا الٰہ الاّ اللہ کے ساتھ صیقل کرو۔ کیونکہ ہر چیز کے لیے ایک صیقل کرنے والی چیز ہوتی ہے اور دل کو صیقل کرنے والی چیز لا الٰہ الا اللہ ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ پاس انفاس [2] میں مشغول ہو۔ جب سانس باہر آئے تو (دل میں) " لا الٰہ " پڑھے اور جب اندر جائے تو " الاّ اللہ " کا تصور کرے اور اس (عمل) پر ہمیشہ ثابت قدم رہے۔ اس کے بعد اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے توفیق دیں گے کہ دونوں صورتوں میں (سانس آتے اور جاتے وقت) لا الٰہ الاّ اللہ کہنے لگے گا، یہاں تک کہ دل میں " اللہ اللہ " آئے گا۔

اس کے بعد جو کچھ پیش آئے گا اُسے معلوم ہو جائے گا۔ لکھا جائے تو کتاب کے طولانی ہونے کا ڈر ہے، اس لیے " خلوت در انجمن [3] " ہونی چاہیئے۔ اس طرح

---

[1] :۔ مسلم شریف، کتاب الاخلاص۔ رک ریاض الصالحین، اردو، ص ۲۸؛ ابنِ ماجہ، کتاب الزہد (۹) مسند حنبل ۲: ۲۸۵؛ موطا، کتاب الیسر ۳۳۔ وغیرہ

[2] :۔ رجوع کریں بصفحہ ۶۲،

[3] :۔ رجوع کریں بصفحہ ۳۶،

مشغول ہو کہ جب دل سے "لا إلٰہ" کہنا شروع کرے تو ایسا ہو جیسے غیر اللہ بالکل دل سے نکل گیا اور گردن و سر کو دائیں کندھے کی طرف گھما کر حلقہ بنائے اور پھر بائیں جانب ایسا ہی کرے اور دل کے منہ پہ متواتر ضربیں لگائے جیسے اللہ تعالیٰ کے انوارات میں سے کوئی چیز دل میں داخل ہو رہی ہے اور کہے "الّا اللّٰہ" اور ضرب اس طرح لگائے کہ دل کے اندر سے آواز آئے۔ ضرب سے دل متاثر ہو اور یہ جلی ہے (بہت ظاہر و روشن)۔

دوسرا حلقہ "لا" کا دل سے شروع کرے اور "لا" کو کھینچ کر سر اور گردن کو دائیں کندھے تک لے جائے اور "اللّٰہ" کہے اور پھر دل پہ ضرب لگاتے ہوئے "الا اللّٰہ" کہے۔ یہ حلقہ جلی ہے۔ اگر چاہے کہ ذکر خفی کرے جو جلی کے مقابلے میں ہوتا ہے تو نہ لفظوں کی آواز آئے اور نہ ربط[1] کی۔ بلکہ ایسا آہستہ ذکر کرے کہ اگر کوئی آدمی پہلو میں بیٹھا ہو تو وہ بھی آواز نہ سنے اور اُسے پتہ ہی نہ چلے کہ یہ ذکر کر رہا ہے۔ یہ (ذکر) دنیاوی خیالات اور وسوسوں کو ذہن سے نکالنے کے لیے بیحد مفید ہوتا ہے۔ سب سے افضل ذکر، ذکرِ خفی ہوتا ہے۔ جس ذکر کے لیے آواز سے کرنے کی سند[2] (تلقین) آئے اُسے جلی کہتے ہیں اور جس کے لیے خفی کی سند آئے اُسے

---

[1]:۔ دو چیزوں کے درمیان جو نسبت قائم ہوتی ہے ربط کہلاتی ہے۔ ذکر میں دل اور زبان کے درمیان چونکہ صرف سانس کا ہی ربط ہوتا ہے اس لیے اسے ربط کہتے ہیں۔ ذکر خفی میں اِس سانس کی بھی آواز نہیں آنی چاہیئے۔ (مستفاد از فرہنگ علوم عقلی، صہ ۲۷۳، قول الجمیل صہ ۶۴)۔

[2]۔ لفظی معنی وہ شخص جس کی بات قابلِ قبول ہو۔ شیخ یا مرشد کی طرف سے جس طرح ذکر کرنے کی تلقین یا اجازت آئے اُسی کو سند کہتے ہیں۔ اگر تلقین جلی کے لیے ہو تو ذکر جلی کیا جائے گا۔ لیکن اگر سند، خفی کے لیے ہو تو ذکر خفی (آہستہ) ہوگا۔ (مستفاد از فرہنگ۔ آنندراج و افادات مولانا مظہر کبیر)

خفی کہتے ہیں۔

ذکر کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اس خیال سے کہ کتاب طویل نہ ہو جائے بیان نہیں کی گئیں۔ کیونکہ ایک صاحبِ دل کے لیے تو ایک حرف بھی کافی ہوتا ہے۔

نیز جاننا چاہیئے کہ دل ایک صنوبر کے ٹکڑے کی مانند ہوتا ہے۔ بائیں جانب دل کا اوپر کی طرف سے رُخ بائیں جانب کو ہوتا ہے۔ یعنی کہا جاتا ہے کہ بائیں طرف کو مائل ہوتا ہے۔ اور ذکر کو پانچ سو مرتبہ سے کم نہیں کرنا چاہیئے اس سے زیادہ ہو جائے تو زہے سعادت۔ اگر مذکورہ تعداد زیادہ لگے تو جس قدر وہ کر سکے۔ فائدہ دے گا۔

جب ذکر سے فارغ ہو تو مراقبہ میں مشغول ہو جائے۔ یعنی اللہ تعالےٰ کو حاضر و ناظر و شاہد اور اپنے ساتھ جانے۔ ذکر و مراقبہ سے فارغ ہو کر "حبسِ نفس[1]" کا ذکر کرے اور سانس کو رک رک کر لمبا کر کے خارج کرے۔

نیز جانے کہ ذکرِ خفی یا حبسِ نفس ذکرِ جلی کی بہ نسبت توہمات اور دنیاوی خیالات کو دور کرنے کا مجرب نسخہ ہے۔ جب طالب ذکر میں مشغول ہوا اور ذکر کا اثر دل تک پہنچے تو دل ذاکر بن جاتا ہے اور طالب کو محسوس اور معلوم بھی ہونے لگتا ہے۔ دل کا ذکر کیا ہے؟ (خدا کو) بھول جانے کی ضد ہے۔ یعنی خدا کو مسلسل یاد رکھنے کا ذریعہ ہے۔ ایک مدت کے بعد ذکر (کا اثر) روح تک پہنچتا ہے۔ یعنی اللہ کے امر اور رحمت کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے۔ اس کے بعد ذکر کا اثر سر تک پہنچتا ہے۔ یعنی ذاتِ الٰہی کے نور کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد ذکر خفی ہوتا ہے۔ یعنی طالب فنا فی اللہ ہو جاتا ہے۔

---

[1] :۔ ذکر کا ایک خاص طریقہ ہے جسے "حبسِ دم" بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں آنکھیں اور منہ بند کر کے، زبان تالو کو لگا کر، سانس روک لی جاتی ہے۔ پھر "لا" کو ناف سے نکال کر دائیں کندھے تک لایا جاتا ہے۔ کچھ دیر سانس روک کر الا اللہ کے تصور کے ساتھ چھوڑا جاتا ہے۔ (مستفاد از ضیاء القلوب ص ۱۸)

اس کے بعد غیب الغیب کا ذکر ہونا ہے اور اس کے بعد فنا ر الفنا (کا مرحلہ آتا ہے چاہیئے کہ چلتے وقت ایک قدم پر "لا الہ" کا تصور کرے اور دوسرے قدم پر "الا اللہ" کا تصور کرے یا دونوں بار "الا اللہ" کا ہی تصور کرے یا لفظ "اللہ" کا تصور کرے۔ اگر آہستہ سے پہلے قدم پر "لا" دوسرے پر "الہ" تیسرے اور چوتھے پر "الا اللہ" کا تصور کرے تو اس کا (طبیعت پہ) گہرا اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح اگر پہلے دونوں قدموں پہ "اللہ" کا تصور کرے اور اگر چاہے تو پہلے چار قدموں پر "لا الہ" کا اور دوسرے چار قدموں پر "الا اللہ" تصور کرے (تو بھی بہت مؤثر ہو گا) بشرطیکہ آہستہ چل رہا ہو۔ اگر پہلے تین قدموں پہ لفظ "اللہ" کا تصور کرے اور اگلے چار قدموں پر "یا اللہ" کہے (تو بھی بہت فائدہ ہوگا۔) "یا اللہ" کو اس طرح سے بھی کہے کہ جب قدم اٹھائے تو اس وقت گردن کو بھی تھوڑا سا آسمان کی طرف اوپر اٹھائے اور پھر لفظ "اللہ" کہتے ہوئے دل پر ضرب لگائے تو حقائق کو دل پر کھولنے کے لئے اس کا بہت ہی اچھا اثر ہوتا ہے۔ اگر اشارے سے یا خیال سے کہے تو جو بھی ذکر ہو، وساوس کو دور کرنے کے لیے بے حد مفید ہے اور لفظ "اللہ" کا دل میں تصور کرے تو شیطانی خیالات کو ختم کرنے کے لیے اور بھی فائدہ مند ہوتا ہے۔ جاننا چاہیئے کہ چلتے چلتے ذکر کا کرنا بہت ہی مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ چلتے میں آدمی گرم ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اثر زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے چاہیئے کہ آدمی ہر حال میں ذکر کرتا رہے جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے۔ "الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلی جنوبھم"[1]

(آل عمران ۳: ۱۹۱)

جاننا چاہیئے کہ ایک لمحہ بھر کے لیے بھی اپنے شیخ (کی یاد) سے غافل نہ ہو، خواہ شیخ بقید حیات ہو یا اس کا وصال ہو چکا ہو۔ اگر کوئی چاہے کہ اپنے شیخ سے

---

[1] یہ وہ لوگ ہیں جو کھڑے ہوں یا بیٹھے اپنے رب کا ذکر کرتے ہیں۔

فیض حاصل کرے تو "اے شیخ" کہتے ہوئے تھوڑی سی گردن اونچی کرے اور "یا شیخ" کہتے ہوئے دل پر ضرب لگائے اگر "فلاں شیخ" کہے اور دل میں اُن کا تصور بھی کرے تو بہت ہی اچھا ہے البتہ شیخ سے بہت زیادہ فیض تو کسی کو ہی نصیب ہوتا ہے۔

جاننا چاہیئے کہ نماز ہر مسلمان کے پیچھے پڑھنا روا ہے لیکن ہر مسلمان کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی جا سکتی۔ جب شیخ (کامل) مل جائے اور اُس پر یقین آجائے تو فوراً مرید بن جائے اور تاخیر نہ کرے۔ (مشائخ) کا کہنا ہے کہ جس کا کوئی شیخ نہ ہو اس کا شیخ شیطان ہوتا ہے اور اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے "یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ"[1] (مائدہ ۵:۳۵)

اس لیے وسیلہ تلاش کرنا ضروری ہے اور مرید ہو جانے کے بعد اگر شیخ میں کوئی ایسی بات دیکھے تو بدگمان نہ ہو اور اس کے بارے میں تجسّس نہ شروع کر دے، بلکہ اپنے کام سے غرض رکھے۔ جو کوئی شیخ کی طلب میں ہو ایسا ہے جیسے اس نے شیخ کو پا لیا، جس طرح نماز کا منتظر بھی نماز ہی میں سمجھا جاتا ہے[2] جس شیخ کا مرید بننا چاہتا ہے چاہیئے کہ وہ بھی اس کی طرف توجہ فرماتے ہوں۔ مثلاً اگر کوئی شیخ نظام الدین کا مرید بننا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ بھی اس کی طرف توجہ فرماتے ہوں تاکہ مقصد حاصل ہو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم بھی ویسے ہی (نیک) کام کرتے ہیں جو شیخ کرتا ہے۔ تو پھر شیخ کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن (روحانی) فائدہ شیخ کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ جیسے کشتی کے سارے ملازم مختلف کام کرتے ہیں۔ لیکن ملاّح کے

---

[1]: اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور اللہ تعالےٰ تک پہنچنے کے لیے وسیلہ تلاش کرو۔

[2]: المنتظر للصلوۃ کانہٗ فی الصلوۃ (حدیث شریف) بخاری، کتاب المواقیت الصلوۃ ۲۲ کتب حدیث میں الفاظ مختلف ہیں۔

بغیر فائدہ نہیں ہوتا۔ اگرچہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم (نبوت سے قبل بھی) خدا تعالےٰ کی عبادت میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے اور خدا تعالےٰ کی ناراضگی والے کاموں سے بالکل دور رہتے تھے اور غارِ حرا میں اکیلے یادِ خدا میں لگے رہتے تھے اور گوشہ نشینی اختیار فرماتے تھے۔ لیکن جبریئل علیہ السلام ان کے اور خدا تعالےٰ کے درمیان واسطہ بنے تو اس کے بعد آپ کو کیسے کیسے بلند مقام ملے۔

تیسری فصل

طالب کو چاہیئے کہ اپنے ماتحتوں کی خطاؤں سے جہاں تک ممکن ہو سکے درگذر کرتا رہے اور ہر نیک کی تلقین کرے کیونکہ "وانذر عشیرتک الاقربین[1]" (الشعراء ۲۶ : ۲۱۴)

میں کتنی لطافت ہے اور عدل وانصاف و مروّت۔ "والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین[2]" (آل عمران ۳ : ۱۳۴)

میں کیا عمدگی سے بیان ہوئے ہے۔ اس بات کا بھی ارادہ کرے کہ کسی کا کوئی حق میرے ذمہ نہ رہے اور ظالم نہ بنوں۔ جس کی طرف واللہ لا یحب الظالمین[3] (آل عمران ۳: ۵۷) وان اللہ لایھدی القوم الظالمین[4]" (انعام ۶ : ۱۴۴ وغیرہ۔ قصص ۲۸ : ۵) یعنی یہاں

---

[1]:۔ اور (اس مضمون سے) آپ اپنے خویش واقربا کو ڈرائیں۔

[2]:۔ اور غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگذر کرنے والے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں کو محبوب رکھتا ہے۔

[3]:۔ اور اللہ تعالےٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتے۔

[4]:۔ اللہ تعالےٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتے۔

یہ اشارہ کیا گیا ہے اور اگر اپنے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی، گائے، گدھا، خچر کو مارے تو صرف ان کے فائدہ کے لیے نہ کہ اپنی خواہش سے اور جو کچھ اُن کو کھلائے صرف اللہ کے حکم کی تعمیل میں کھلائے نہ کہ اپنی مرضی سے۔ اسی طرح اپنے بیوی بچوں، کنیزوں، غلاموں اور ملازموں کو جو کچھ دے یا کھلائے وہ بھی اللہ کا حکم پورا کرنے کی نیت سے کھلائے نہ کہ اپنے آرام و آسائش کی اُمید پہ۔ اور جب بھی اپنی بیوی سے ہمبستری کرے تو اپنے یا اپنی بیوی کے دل سے فاسد خیالات کو دُور کرنے کی نیت سے کرے نہ کہ اپنی لذت و خواہش کی تسکین کے لیے۔ اس بات کو خوب اچھی طرح اپنے دل میں یاد رکھے کہ صرف اللہ ہی کی خاطر محبت اور اللہ ہی کی خاطر کسی سے بغض رکھنا ہوگا۔ نیز سماع کو کسی طرح بھی حرام نہ سمجھے اس لیے کہ سماع قربِ الٰہی کا سب سے زیادہ مُوثر ذریعہ ہے اور اگر ہو سکے تو ہر روز سورہ اخلاص اور درود شریف ہزار ہزار مرتبہ پڑھے۔ جو کوئی سورہ اخلاص زیادہ پڑھے گا۔ اس پر قربِ الٰہی یا ہدایت کی (ساری) راہیں کھل جائیں گی اور جو کوئی درود شریف کا (زیادہ) وِرد رکھے گا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (آخرت کی ساری مشکلات میں) اس کی مدد فرمائیں گے اور (درود شریف پڑھنے سے) ریاضت عبادت کی وجہ سے اگر (دل میں) غرور سا پیدا ہو تو وہ بھی دُور ہوگا۔ اگر اس مقدار میں نہ پڑھ سکے تو جس مقدار میں بھی پڑھ سکتا ہو پڑھ لے۔ چشتیہ سلسلے کی دلیل، دنیا والوں کے چراغ، حضرت قطب الدین (بختیار) ہر رات میں چار ہزار بار درود شریف پڑھتے تھے۔ چاہیئے کہ اپنے بزرگوں اور آباء و اجداد پر فخر نہ کرے یعنی اپنے سیّد یا صدیقی یا فاروقی یا عثمانی اور علوی ہونے پر فخر نہ کرے اور فخریہ طور پر یہ نہ کہے کہ ہم فلاں بزرگ کی اولاد ہیں اور ہمارے دادا فلاں شیخ تھے لہٰذا عمل کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح کسی دوسرے پر فخر کرنا اور کسی کو بلا وجہ شرعی ذلیل کرنا (ممنوع ہے)۔

چوتھی فصل

طالب کو چاہیئے کہ جمعہ کے دن (اسلامی معمولات) کو زندہ کرے اور اس دن سے غافل نہ ہو کیونکہ یہ ایک عظیم دن ہے۔ اِس دن دنیاوی کاموں میں مصروف نہ ہو سوائے ان کاموں کے جو بہت ضروری ہوں۔ جمعہ کی رات اور دن میں درود شریف بہت زیادہ پڑھے اور جمعہ کے دن کی آخری گھڑیوں میں، جس مقدار میں "یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم" کہہ سکتا ہو کہے۔ اگر ممکن ہو تو اِس روز تسبیح پڑھے۔ جمعہ کی نیت سے غسل کرنے کو کبھی نہ چھوڑے سوائے اس کے کہ ضرورت ہو۔ اگر فجر کی نماز کے بعد غسل کرنا چاہے تو بھی ٹھیک ہے لیکن افضل یہ ہے کہ نماز جمعہ کا وضو اور غسل ایک ساتھ کرے۔ اگر یہ سمجھے کہ جمعہ کے دن غسل کرنا مشکل ہو گا تو جمعرات کو ہی (جمعہ کی نیت سے) کر لے۔

پانچویں فصل

جاننا چاہیئے کہ جو کوئی اس رسالے پر عمل کرے گا اُمید ہے کہ اُسے اصلی مقصود، جو اختیاری موت[1] ہے حاصل ہو جائے گا اور دُنیا کا بھی کوئی نقصان نہ ہو گا

---

[1]: نفسانی خواہشات کو مار کر دنیاوی لذتوں سے کنارہ کش ہو جانے کا نام ہے۔ اس سے معرفتِ الٰہی نصیب ہوتی ہے۔ انسان اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مال کو راہِ خدا میں بے دریغ خرچ کرتا ہے اور یوں مال کی محبت کو دل سے یکسر نکال دیتا ہے۔ رضائے الٰہی کے لیے فنا فی اللہ ہو جانا بھی یہی ہے اور "موتو اقبل اَن تموتو" میں بھی کم و بیش یہی صورت ہوتی ہے۔ (مستفاد از فرہنگ علوم عقلی ص ۵۸۴)

اس لیے کہ آج کل دنیا اپنی ایک حالت میں قائم نہیں رہتی لہٰذا (اس کا) کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اختیاری موت یا تو جذبۂ الٰہی سے حاصل ہوتی ہے یا اپنی محنت ومجاہدے سے۔ اگر جذبۂ الٰہی سے میسّر آجائے تو فبہا ورنہ محنت ومجاہدے سے حاصل کی جائے اور محنت ومجاہدے کا طریقہ اس رسالے میں اختصار کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔ بہرکیف جو کوئی طالبِ حق ہو اس کے لیے افضل ہے کہ اس رسالے کو اپنے پاس رکھے۔ اسے پڑھے اور اسے آنکھوں سے لگائے اور اسے اپنے دل کی تسکین کا سامان بنالے۔ اگر پڑھنا نہ جانتا ہو تو کسی سے سنے اور اس پر عمل کرے تاکہ اختیاری موت حاصل ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الباب ثلاثہ

الحمد للہ رب العالمین و العاقبۃ للمتقین و الصلوٰۃ (و السلام) علیٰ رسولہ محمد و آلہ اجمعین ۔ اس کے بعد کمزور و نزار اور فقیر حقیر محمد بن قطب الاولیاء شیخ الاتقیا محمد بن احمد ابن نصیر معروف بہ شیخ حسن محمد بن میا نجوا بن نصیر کہتا ہے کہ خدا تعالےٰ اپنی پوشیدہ و ظاہر مہربانیوں سے اُسے کامیاب فرمائے ، اور یہ رسالہ تین الباب پر مشتمل ہے ۔

لبِ اوّل

طالب کو چاہیئے کہ اپنی (تمام تر) ہمت و صلاحیت کو راہِ خدا میں صرف کرے اور دنیاوی لذتوں کو جہاں تک ممکن ہو چھوڑ دے ، اس امید پر کہ اللہ تعالےٰ ہم پر رحمتیں نازل فرمائے اور آخرت والے گھر میں بہشت ، حوریں اور (جنت کے) محلات ہمیں مل سکیں ۔ یہ ادنیٰ طلب ہے ۔

لبِ دوم

طالب کو چاہیئے کہ آخرت (کی زندگی) کا انتظار نہ کرے بلکہ معنوی کمال کے اسرار کو (دنیاوی) صورتوں ہی میں مطالعہ کرے اور ہر چھوٹی موٹی صورت پہ اللہ کی

کمال صنعت گری کو مشعل راہ بنائے۔ یہ درمیانی طلب ہے۔

لبِ سوم

طالب کو اِس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ اس کی ہستی کا پہاڑ فانی بلکہ ریزہ ریزہ ہو کر ختم ہو جائے اور ذات باری تعالٰے کے انوار میں جو تمام صفات کا مجموعہ ہیں، فنا ہو کر بقا حاصل کرے۔ جس نظر سے وہ مظاہر حق کو دیکھ رہا ہے۔ طالب کی اپنی ہستی بالکل معدوم ہو جائے۔ لہٰذا جانے کہ اللہ تعالٰے "الا انھم فی مریۃ من لقاء ربھم الا انہ بِکُلِّ شَیٔ محیطا" [1] (فصلت ۴۱ : ۵۴) کے مطابق ہر چیز پر محیط ہے۔ اس بات پر بھی یقین کرے کہ حق تعالٰے اسباب سے بے نیاز ہے اور اللہ تعالٰے کی حقیقت کو، صحیح صحیح، کوئی نہیں جانتا۔ نہ کوئی ولی اور نہ کوئی نبی۔ اللہ تعالٰے اپنے اسم کے نور سے (ہر چیز پر) محیط ہے چنانچہ ہمارے شیخ قطب الاولیاء نے فرمایا کہ اللہ تعالٰے کی حقیقت، جیسی کہ وہ ہے، کو پانا ممکن نہیں نہ کسی ولی کے لیے اور نہ کسی نبی کے لیے، یہ اعلٰی طلب ہے۔

تمت

---

[1] ۔ یاد رکھو کہ وہ لوگ اپنے رب کے روبرو جانے میں شک کرتے ہیں اور یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔

احوال و آثار

مترجم: ڈاکٹر محمد بشیر حسین (مرحوم)

○

ڈاکٹر محمد اسلم رانا

احوال و آثار

مترجم (ڈاکٹر محمد بشیر حسین مرحوم)

اس دنیائے آب وگل میں رہتے ہوئے انسان اپنی مختصر زندگی میں بے شمار انسانوں سے ملتا ہے ان میں سے بعض کے ساتھ اس کے خونی رشتے ہوتے ہیں، بعض کے ساتھ سماجی، بعض کے ساتھ پیشہ وارانہ وابستگیاں ہوتی ہیں بعض کے ساتھ انسانی اقدار کے حوالے سے میل جول ہوتا ہے اور بعض کے ساتھ خاندانی رابطے قائم ہوتے ہیں۔ ان رشتوں کی نوعیت اخلاقی، سماجی، مذہبی اور معاشی حدبندیوں کے حوالے سے ظاہر ہوتی ہے۔ آپس میں پیار و محبت کے ناطے وجود میں آتے ہیں۔ رنجشیں اور غلط فہمیاں بھی گھر کرتی ہیں اور رقابتیں بھی جنم لیتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان کی اس صحرا جیسی جھلستی زندگی میں جہاں اس کے چہار طرف نفسا نفسی، خود غرضی، بے حسی، بے مروتی اور بد اعتمادی کے جھکڑ چل رہے ہوں وہاں پیار و محبت، امن، بھائی چارہ اور چاہتوں کے خوب صورت نخلستان ان جزیروں کی مانند آباد دکھائی دیتے ہیں جو بپھرے سمندر میں عافیت اور پناہ بن کر نمودار ہوتے ہیں۔ اُس وقت انسان ایسے محسوس کرتا ہے، جیسے جھلسا دینے والے اس پر گھٹن ماحول میں بادِ صرصر کی جگہ بادِ بہاری کے خوش رنگ جھونکے ان جلنے اور ان دیکھے دیسوں سے آن وارد ہوئے ہوں۔ یہ امن کے جزیرے پیار و محبت کے نخلستان اور چاہتوں کے نگر وہ انسان ہوتے ہیں۔ جو اس دنیا میں محبتیں تقسیم کرنے کا فرض لے کر آئے ہوتے ہیں۔ ایسی شخصیتیں موجود تو ہوتی ہیں لیکن اس دورِ خرابی میں مادہ پرستی نے لوگوں سے مہر و محبت کی قندیلیں چھین کر ان کے دل کی آنکھوں کو ہوس کی تیز شعاعوں سے اس طور چکا چوند کر دیا ہے کہ انہیں اپنے چاروں طرف سوائے اپنے آپ کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ہمارے چاروں طرف لوگوں کا ایک سیلاب بے کراں منڈلا رہا ہے۔ جن کے پتھر چہرے، گنگ زبانیں، بہرے کان اور ساکت آنکھیں وقت کے اندھے جبر کی سولیوں پر سوار نفرت کی کھائیوں میں گرتے رہتے ہیں۔

وہ اُن آہٹوں کے نقش فضاؤں میں نہیں سن پاتے جو زندگی کے راست مفہوم کی تلاش میں ان کے اردگرد حیات رہتی ہیں۔

حیات اور کاروبارِ حیات کے سلسلے انسانوں کو ان کی بستیوں سے دور لے جاتے ہیں۔ جن کو وہ ایک مدت تک اپنا سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ اس سے رشتوں کی نوعیت بدلنے لگتی ہے۔ وہ جو اپنے ہوتے ہیں۔ وہ معاشی حوالوں سے نئے وجودوں کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں اور نئی دریافتوں میں بسا اوقات ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو خونی رشتوں کے بھرم توڑ کر پیار و محبت اور درد کے ازلی اور ابدی رابطوں کی نئی دنیا آباد کر دیتے ہیں۔ نئے سفروں کے دوران نفرتوں کے جنگل سے گزرتے ہوئے دور کسی درویش کی کٹیا میں جلتا ہوا امید کا دیا منزل کی آگاہی کا شعور بخشتا ہے۔ یہیں سے زندگی کے نئے موڑ اور نئے باب کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہ ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتا کہ اُسے محبتوں کے امیں میسّر آئیں۔ شعوری کوششوں سے منطقی جوازوں سے فلسفے کے ذریعے، اخلاقی اور مذہبی حوالوں سے ایسا مسیحا، ایسا خضر ڈھونڈنے نکلو گے تو بنوں میں آوارہ پھرتے ہو سکتا ہے گیان نصیب ہو جائے یا ولایت مل جائے۔ لیکن بے چین روح اور دریدہ دل کے درد کا درماں نہ مل سکے گا۔ اس کے لیے دیدۂ بینا چاہیئے۔ دل اور روح کی روشن آنکھوں میں تجسس کی چمک موجود ہو۔ تڑپ، کسک اور نفیِ وجود کی قدرت میسّر ہو۔ تب بات بنتی ہے۔ یہ وجود یہ ہستی ملنے کو ساری عمر نہیں ملتی۔ اور جب کرم ہو جائے مولا کا تو پھر اچانک یہیں کہیں سے اپنے اردگرد ہی سے اس طرح نمودار ہوتی ہے جیسے کلراٹھی زمین سے دودھ رنگ کھمب ابھرتی ہے۔ وجود و ذات کے سارے پردے چاک کرتے ہوئے نفی اثبات کے نئے سلسلے جنم لینے لگتے ہیں۔

ایسی ہستی کا ادراک تین ذریعوں سے ہوتا ہے [illegible] وں کے رستے دل میں اترتی ہے اور پھر دل سے روح کے ایک ایک مسام میں اتر جاتی ہیں۔ ذہن سوچتا رہ جاتا ہے اور عقل حیران رہتی ہے۔ لیکن دل اور رُوح فیصلہ کر لیتے ہیں اور یہ فیصلہ کسی گھڑی، پل، لمحے کے انتہائی ابتدائی حصوں میں ہو جاتا ہے اور پھر یہ گھڑی، پل اور لمحہ کئی صدیوں پر محیط ہو جاتے ہیں اور یہی مقام ہوتا ہے جب حسن اور عشق کے درمیان "کن" کے زور کا میثاق تجدید کے نئے معنوں سے روشناس ہوتا ہے۔ پھر یہ حدیں ختم ہو جاتی ہیں کہ حُسن کیا ہے۔ حسین کون ہے۔ سراپے میں

حسن ہے یا دیکھنے والے کی آنکھ میں۔ کیونکہ پھر حسن آپس کے تعلقات کی ہر نوعیت کے ہر پہلو کی ایک ایک کروٹ میں اپنی جولانیاں بکھیرنے لگتا ہے۔ پھر اس کی ہستی ایک عام انسان کی ہستی نہیں رہتی، بلکہ وہ ایک ایک پل کی عبادت اور مدد کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس کے نقش دل اور روح کی بنجر کھیتیوں کو تر و تازہ اور روشن کر دیتے ہیں۔ اس کے وجود کے ایک ایک خلیئے سے چاہتوں کے بے شمار چراغ روشن ہو کر نئی منزلوں کے راستے متعین کرتے ہیں۔ جن کی روشنی میں بندہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اخلاص کے نئے رنگ محلوں میں جا نکلتا ہے۔ جہاں اس کی اپنی ذات اپنی ہستی اور اپنے وجود کا تصور تک قائم نہیں رہتا بلکہ شعور اور تحت الشعور تک اُسی ذات کا بسیرا رہتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ وہ ہستی عام لوگوں کے لیے ایک عام سے انسان سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ لیکن یہ کبھی ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے کہ وہ کسی کے نزدیک اس قدر معتبر ٹھہرے کہ دنیا جہان کے تمام سلسلے اور ان دیکھے جہانوں کے تمام معاملے اسی ذات کے محور کے گرد گھومتے ہوں، اسی سے شروع ہوتے ہوں اور اسی پر آکر ختم ہوتے ہوں۔ اس کی ذات کے بغیر دنیا کی ہر شے وقعتوں کے انتہائی نچلے درجے کو ترستی پھرے۔

ڈاکٹر محمد بشیر حسین (مرحوم) کی ذات میرے لیے ایسی ہی ہستی تھی جس کے وجود نے، جس کے دل اور روح نے میرے خیالات، تصورات اور احساسات کے نہاں خانوں میں موجود اور ناموجود کے سارے راستے مسدود کر کے مختلف سمتوں کے رخ ایک نشان پر متعین کر دئے تھے۔ کہنے کو وہ اب اس دنیا میں نہیں لیکن میرے شب و روز کا وہ لمحہ یقیناً "غافل لمحہ" ہوتا ہوگا جب میں انہیں یاد نہ کرتا ہوں گا۔ محسوس نہ کرتا ہوں گا۔ مجسم صورت میں اپنے سامنے نہ پاتا ہوں گا۔ اور سوچتا نہ ہوں گا۔ سوچیں ہیں کہ سمندر کی لہروں کی طرح اٹھتی چلی آتی ہیں اور اپنے ساتھ ہر اس خیال اور ہر اس تصور کو بہا لے جاتی ہیں۔ جن کا تعلق میاں جی کی ذات، وجود روح یا دل کے ساتھ نہ ہو۔ ماضی قریب میں گزری ان گنت یادوں کے ان گنت ورق کھلتے بند ہوتے نظر آتے ہیں۔ آج ان یادوں اور سوچوں کو جب جمع کر کے میاں جی کے بارے میں کچھ لکھنے لگا ہوں تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا لکھوں۔ ذہن میں جالے سے بنے جا رہے ہیں۔

دماغ میں احساسات گڈمڈ ہونے لگے ہیں۔ اور دل دریا کے اندر آہوں اور سسکیوں کے بے شمار بیڑے ڈوبنے تیرنے لگے ہیں۔ وہ یادیں کبھی جن کی ہلکی سی آہٹ کے ساتھ دل کے سب دروازے کومل جذبوں کی شہ پا کر انمول ترنگ کے ساتھ کھل جایا کرتے تھے۔ مگر اب وہی یادیں ایک مسلسل درد کا روپ دھار کر رگ و پے میں اترتی چلی جا رہی ہیں۔

یوں تو میاں جی بشیر حسین کو ہم سے بچھڑے ہوئے تھوڑا عرصہ گزرا ہے۔ لیکن ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جدائی کے یہ چند ماہ صدیوں پر محیط ہیں اور وچھوڑے کا یہ دکھ شائد روزِ میثاق ہی سے مقدر ٹھہرا تھا۔ کہنے کو تو میاں جی سے دلی یگانگت، ذہنی ہم آہنگی اور جذباتی قربت کا دور پانچ سال کے عرصے پر محیط تھا لیکن محسوس ایسے ہوتا ہے کہ یہ تو کاروانِ حیات کی شہر سرائے تھا، اصل میں تو ہمسفری کے سلسلے روحوں کے وجود پانے کے ساتھ ہی شروع ہو گئے تھے اور روحیں الگ الگ وجودوں میں قید ہو کر تڑپ کے نئے معنی تخلیق کرتی رہیں۔ پھر جب انہوں نے پہچان کی منزلوں کو پا لیا تھا اور وجود کی حقیقتیں ختم ہو گئی تھیں تو فراق کے نئے در وا ہو گئے۔ ہجر کے نئے سلسلوں نے "کُن" کے روز سے جاری مسافتوں کو ایک عارضی پڑاؤ سے روشناس کرا کے ابد کی نئی منزلوں کے راستوں پہ ڈال دیا ہے۔ اب تو کہی اور ان کہی داستاں کے بہت سارے باب ادھورے رہ گئے ہیں۔ بے پناہ شیریں یادیں اور خوشگوار لمحات بکھر گئے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی میری روح، میرا دل اور میرا ذہن بھی بکھر گیا ہے۔ میرے وجود کی ساری توتیں مٹ گئی ہیں۔ میری حالت اس مسافر جیسی ہو گئی ہے جو حالات کے جھلسا دینے والے صحرا سے گزر کر ایک سائے کی پناہ میں آ گیا ہو۔ لیکن سائے کے اٹھ جانے سے اسے معلوم ہو کہ ہجر کے کئی تپتے صحرا ابھی اس نے تنہا عبور کرنے ہیں۔ میاں جی بشیر حسین مجھے مہربان اور ٹھنڈے سائبان کی طرح زندگی کی تلخیوں کے تپتے سورج کی تیز شعاعوں سے بچائے رکھتے تھے۔ اس مہربان اور شجرِ سایہ دار کے پتوں، ٹہنیوں، شاخوں، پھولوں، پھلوں اور جڑوں کی کس طرح آبیاری ہوئی۔ کن موافق اور ناموافق موسموں میں وہ ایک ننھے سے پودے سے گھنا پیڑ بنا اور پھر کیسے بہاروں میں خزاں کی رتوں نے طوفانوں کے رُخ اس کی جانب موڑے کہ درخت اپنی پناہ میں بیٹھے ہوئے سبھی کو بے سایہ کر گیا۔ میاں بشیر حسین کی زندگی کے حالات اصل میں ایک

دیے کی کہانی ہے ایک مٹی کے دیے کی۔ جو ایک مٹی کے گھر میں روشن ہوا اور ساری جباتی تیز جھکڑوں اور تند خو طوفانوں کی یلغاریں سہتا رہا۔ یہ تو تھیں جذبوں کی چند باتیں، احساس بھرے جملے، دکھ درد کے رشتوں کی کیفیتیں اور دردِ دل کے کچھ سلسلے ۔ اب کچھ باتیں ہو جائیں میاں جی کی زندگی کے بارے میں کہ اس کے بغیر یہ بابِ الم ادھورا ہی رہ جائے گا۔

خاندانی پس منظر

ڈاکٹر میاں محمد بشیر شین مرحوم ارائیں خاندان کے چشم و چراغ تھے جو کہ مشرقی پنجاب کے مردم خیز علاقے جالندھر سے نقل مکانی کر کے ساندل بار (فیصل آباد) کے علاقے میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ تاریخ انسانی کے کسی بھی دور پر نگاہ ڈالیں، انسان، قبیلے اور قومیں بہتر معاشی ذریعوں کے حصول کی خاطر ہجرتوں کے سلسلوں سے بندھی نظر آتی ہیں۔ چنانچہ یہ خاندان بھی دوابہ بست جالندھر میں معاشی مجبوریوں سے ستایا ہوا نئی آبادیوں کی طرف ہجرت کر آیا۔ انگریزوں نے ۱۸۴۹ء میں جب پنجاب کے مغربی حصے پر قبضہ کیا تو ان کے ستلج کے مشرقی مقبوضہ علاقوں سے بے شمار قبیلے ضلع منٹگمری (ساہیوال)، لائل پور (فیصل آباد) سرگودھا وغیرہ آکر نئے نہری نظام کے تحت نئی زمینوں پر آکر آباد ہو گئے۔ جالندھر میں یہ خاندان آدم پور گاؤں سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ اس قبیلے کے سربراہ کا نام میاں گاندھی تھا جو میاں بشیر صاحب کے دادا صاحب تھے۔ یہ لوگ لائل پور (فیصل آباد) تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ (اب ضلع) کے چک نمبر ۳۲۲۔گ۔ب (گوگیرہ برانچ) میں آبسے اور اپنے قدیم پیشے یعنی کاشت کاری میں مصروف ہو گئے۔ بنجر، بے آب و گیاہ ریت کے ٹیلوں اور جنڈ کریروں سے اٹی دھرتی کو کاشت کے قابل بنایا اور اپنی محنت سے اس علاقے کو اپنی چھوڑی ہوئی زمین جیسا زرخیز اور خوشنما بنا دیا۔ ارائیں قوم ویسے بھی زراعت کے پیشے میں محنت اور جانفشانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی اور اسے عبادت سمجھ کر کرتی ہے۔

آپ کے والد صاحب کا نام میاں عمر دین تھا۔ وہ بھی چک نمبر ۳۲۲۔گ۔ب میں ہی پیدا ہوئے۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خاندان کافی عرصہ پہلے اس بار میں آکر آباد ہو گیا تھا آپ کے والد صاحب اللہ لوک اور درویش صفت انسان تھے۔ دنیاوی کاموں میں بہت کم

دلچسپی لیتے تھے۔ کاشتکاری زیادہ تر ان کے بھائی ہی کرتے تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ کا نام حُرمت بی بی تھا جو ایک مہربان اور پیار کرنے والی ہستی تھی۔ اس عظیم عورت کو اللہ نے بہت زیادہ ہمت عطا کی تھی اور بلند حوصلہ بھی میاں عمردین کی گھریلو اور معاشی امور میں عدم دلچسپی کی بدولت یہ محترم ہستی بیک وقت اپنے بچوں کی ماں بھی تھی اور باپ بھی۔ انہوں نے باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا کے تمام تر امکانات اپنے بچوں پر لٹا دیئے۔ اور انہیں کسی بات کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ کچے گھروں کی اس کچی بستی میں ایک کچے مکان میں اس نے پختہ عزم کے ساتھ زندگی بسر کی۔

پیدائش، بچپن اور ابتدائی تعلیم

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ یہ کہانی ہے ایک دیئے اور طوفان کی۔ ایک ایسے مٹی کے دیئے کی جو اس خطے کے ثقافتی، سیاسی اور معاشی مرکزوں سے دور ایک پس ماندہ بستی میں ایک مٹی کے گھر میں یکم جنوری ۱۹۳۱ء کی سنہری سویر کو سحرے سورج کے ساتھ ہی روشن ہوا کہ رات کی تاریکی کو اب تیل کے چراغوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ نئے سویروں کی بشارت بن کر سورج کے ساتھ طلوع ہونے والے کو ماں باپ نے بشیر احمد کا نام دیا۔ جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ والد محترم دنیاوی جھمیلوں سے دور ہی رہتے تھے۔ اس لیے شعور کے ابتدائی سالوں ہی سے میاں جی نہ صرف گھر کے کاموں میں ماں کے معاون بن گئے بلکہ وہ کھیتی باڑی میں اپنے والد کے بھائیوں کا ہاتھ بٹانے لگے۔ ماں نے اس چراغ کی روشنی کے لیے اپنی ممتا کا سارا شہد اور چاہتوں کا سارا رس بخش دیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ اس چراغ کو حوادثِ زمانہ سے بچا کر اپنی شفقتوں کے دامن میں سمیٹے رکھے۔ اس پیار کرنے والی ہستی نے اس ننھے مُنے اور معصوم کے دل، ذہن اور دماغ میں زندگی گزارنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ نامتفق حالات اور ناموافق صورتِ حال میں عزم و ہمت کی نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ ایمان کا تیل اور اعتقاد کی بتی اس چراغ کو بخشی جس سے اس کی روشنی نکھرتی چلی گئی۔ لیکن ناموافق ہوائیں، حالات و مسائل کے تند خو جھکڑ اور حوادثِ زمانہ کے طوفان تو چراغوں کی دشمن قوتیں ہیں جو ازل سے ابد تک اس سے ٹکراتی چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بچپن کا وہ زمانہ جو کھیلنے کودنے

چہلیں کرنے، ماں باپ کی شفقتیں سمیٹنے، ضدیں کرنے اور منوانے، لاڈ پیار کے خزینے اکٹھے کرنے، معصوم شرارتوں اور کومل جذبوں کی اٹھان کا زمانہ ہوتا ہے۔ میاں جی کے لیے آغازِ امتحان کا زمانہ بن گیا۔ آٹھ دس سال کی عمر میں جب کہ وہ گاؤں کے پرائمری سکول میں ہی ابھی پڑھا کرتے تھے۔ انہوں نے کاشت کاری کے جملہ لوازمات سے نہ صرف آگاہی حاصل کر لی تھی۔ بلکہ وہ سردیوں کی یخ بستہ راتوں میں فصلوں کی رکھوالی کرتے اور کھیتوں کو پانی لگاتے تھے۔ شدت کی گرمیوں میں وہ گندم کی "واڈھی" کرتے تھے۔ مویشیوں کا چارہ کاٹتے اور ہل چلاتے تھے۔ وہ یہ سب کچھ ایک بالغ مرد کے برابر سرانجام دیتے تھے۔ کہ وہ جو خون کے حوالے سے توا پنے ہوتے ہیں۔ لیکن جیسے پنجاب کے دیہات میں کہتے ہیں۔ "اَج دے بھرا کل دے شریک" انہیں نہ تو کسی کی معصومیت کا خیال ہوتا ہے اور نہ ہی جانِ ناتواں کا انہیں تو برابر کا کام کرنے والا چاہیئے اگر باپ اس قابل نہیں تو یہ ننھی سی معصوم جان ہی سہی۔ ورنہ اپنے حصے کی تھوڑی بہت زمین سنبھالیں اور الگ ہو جائیں۔ چنانچہ اس مٹی کے ننھے سے دیئے کے اپنے روشن ہونے کے آغاز ہی سے ناموافق ہواؤں سے واسطہ پڑ گیا۔

میاں جی بشیر حسین نے اپنے گاؤں یعنی چک نمبر ۳۲۲ گ۔ ب سے پرائمری کا امتحان جو اس زمانے میں کلاس چہارم تک ہوتا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں پاس کیا۔ ازاں بعد انہوں نے جونیئر ورنیکلر فائنل (پانچویں اور چھٹی) کا امتحان ۱۹۴۲ء میں پاس کیا۔ اس دوران وہ ایک مکمل کاشت کار کے طور پر اپنے کھیتوں میں بھی پوری ذمے داری اور جانفشانی سے کام کرتے رہے۔ زندگی بچپن ہی سے کٹھن ہو گئی تھی اور حالات کے مطابق اسے بسر کرنا انہوں نے سیکھ لیا تھا۔ وہ جو "اپنے" تھے چاہتے تھے کہ اس چراغ کا سارا تیل اور ساری بتی رائیگاں جائے۔ علم کی روشن کرنیں اس کی روشنی کو اور زیادہ ضوفشاں نہ کردیں۔ لیکن جب دیئے کے اندر روشنی حاصل کرنے اُسے جذب کرنے اور بکھیرنے کا عزم اور جذبہ ہو تو اندھیروں کی ساری منفی قوتیں اس کی روشنی کو نہیں روک سکتیں۔ وہ مٹی کا چراغ حالات کا مقابلہ مردانہ وار کرتا رہا۔ وہ اس ماحول سے نکل کر اک جہان کو اپنی روشن کرنوں سے منور کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے تو سرد گرم موسموں کی تمام تر شدتیں نہ تو اسے کھیتی باڑی کے کام سے روک سکیں۔ اور نہ دور کے گاؤں میں جا کر تعلیم حاصل کرنے کے

عزم کو ڈگمگا سکیں۔ وہ اپنے کنبے کے لیے روٹی بھی حاصل کرتے رہے اور خود زندگی گزارنے کے مفہوم بھی تلاش کرتے رہے۔

میاں جی بشیر صاحب کی زندگی کے ابتدائی سالوں میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ یہ واقعہ بظاہر بڑا معمولی سا نظر آتا ہے۔ لیکن اپنے پیش منظر کے حوالے سے بڑا اہم ہے۔ جب میاں جی نے ورنیکلر فائنل کا امتحان پاس کیا تو خدا معلوم وہ کون سے حالات و واقعات تھے کہ مٹی کے اس چراغ پر مصائب کی آندھی نے اس طور یلغار کی کہ تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور چراغ ٹمٹما کر رہ گیا۔ معصوم بشیر زندگی کے ایک کٹھن سفر پر روانہ ہو گیا۔ ماں کا لاڈلا پتہ نہیں کن کٹھن حالات سے تڑپ اٹھا ہو گا کہ اپنے پیاروں کو چھوڑ کر ملتان چلا گیا۔ وہاں جا کر دستی کھڈیوں پہ دریاں اور کھیس بُننے کا ہنر سیکھا۔ اس سے جو مزدوری ملتی وہ گھر بھیج دیتے۔ اتنی چھوٹی عمر میں پردیس میں اجنبیت کے چرکے کھا کھا کر روح کی بے چینی اور دل کی بے کلی اور بڑھ گئی۔ جستجو، تجسس کے ان جانے در وا ہوئے تو ایک دفعہ پھر اسی مٹی پہ قدم کھینچ لائے جس سے خمیر اٹھا تھا۔ واپس آکر ماں کی گود میں سر رکھ کر بے اختیار رو پڑے۔ ممتا تڑپ اٹھی اور پھر اپنے دامن میں اپنی پناہ میں لے کر اس چراغ کو نئے عزم عطا کیے۔

ملتان سے واپسی پہ بشیر صاحب نے ۱۹۴۳ء میں غوثیہ اسلامیہ ہائی سکول چک نمبر ۳۳۳ گ ب میں داخلہ لے لیا۔ وہ پیدل چل کر سکول جاتے اور پیدل ہی یہ پانچ چھ میل کا فاصلہ طے کر کے واپس آتے تھے۔ واپس آکر کھیتی باڑی کا سارا کام کرتے تھے۔ اس طرح میاں جی کی نس نس میں بچپن اور لڑکپن ہی سے محنت، مشقت، جدوجہد، بلند ہمتی اور عالی حوصلگی جیسے جذبے اور جوہر پیدا ہو گئے جو تمام عمر ان کے ساتھ رہے۔ وہ اس سکول میں ۱۹۴۷ء تک رہے اور ۱۹۴۷ء میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ سوچنے کی بات ہے کہ میاں جی جو کہ بچپن میں بشیر احمد تھے وہ محمد بشیر حسین کیسے بنے۔ ان کی معصومیت اور بھولے پن کا یہ کتنا خوبصورت انداز ہے۔ ہوا یوں کہ میاں جی کے سیکشن میں بشیر احمد اور محمد بشیر نام کے ایسے تین چار لڑکے پڑھتے تھے جن کے باپوں کے نام بھی عمر دین ہی تھے۔ چنانچہ جب میٹرک کے امتحانات کے لیے پنجاب یونیورسٹی کو داخلے کے فارم بھیجنے کا مرحلہ آیا تو ہیڈ ماسٹر نے کہا کہ تم میں سے کچھ بشیر

اپنے ناموں کے ساتھ کچھ سابقے لاحقے لگا لیں تاکہ امتحان کے لیے رول نمبروں یا رزلٹ وغیرہ میں کوئی گھپلا نہ ہو جائے۔ ان میں سے ان کے علاوہ لڑکوں نے اس وقت کے جدید نام تخلص کے طور پہ اختیار کر لیے۔ لیکن یہ بشیر احمد سے محمد بشیر حسین بن گئے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ان کے بزرگ اس وقت بھی اور اب بھی (جو حیات ہیں) گھر پہ انہیں بشیر احمد کے نام ہی سے پکارتے رہے ہیں۔ سکول کے زمانے میں میاں جی فٹ بال، کبڈی اور والی بال کے کھلاڑی رہے ہیں اور سکول کی ٹیموں کے بڑے فعال رکن تھے۔ تعلیمی لحاظ سے محنتی ہونے کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے، اور اساتذہ کی بے پناہ عزت کرنے کی وجہ سے وہ ان کی آنکھوں کا تارا بنے رہے۔

جب میاں بشیر صاحب نے دسویں کا امتحان پاس کیا تو پیار کرنے والی مہربان ماں کے دل کی مرجھائی کلی پھر سے کھل اٹھی، اب اس دیئے کی مدھم مدھم روشنی نئی منزلوں کو تلاش کرنے لگی تھی۔ اس وقت ماں نے ان کی روشن پیشانی چومتے ہوئے کہا تھا کہ ایک دن میرا بشیر بھی ساتھ والے پی اے پاسوں کے گاؤں کے باسیوں کی طرح بی اے پاس کرے گا۔ لیکن ماں کی قسمت میں نہیں تھا کہ وہ اپنے اس ننھے منے دیئے کو ایک روشن چراغ کی مانند پوری آن بان اور شان کے ساتھ روشنیاں بکھیرتے دیکھتی۔ وہ اُسے چھوٹے بڑے طوفانوں میں گھرا چھوڑ کر میٹرک پاس کرنے کے صرف ایک سال بعد ہی یعنی ۱۹۴۸ء کو دوسری دنیا میں جا بسی۔ پدری شفقت، مجذوبیت کے پردوں کے پیچھے پنہاں تھی اور ماں کی ممتا نے جنت میں ٹھکانے ڈھونڈھ لیے تو اللہ نے اس چراغ کی حفاظت اور پرداخت کے نئے سلسلے پیدا کر دیئے۔ ممتا کا سایہ سر سے اٹھا تو پھوپھی کی محبت اور چاہت کی چادر تن گئی۔ میاں جی کی اس پھوپھی کی اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے اپنا سارا پیار اور ساری ممتا اپنے بھتیجوں پہ نچھاور کر دی۔ میاں جی کے دو اور بھائی ہیں۔ ایک کا نام منظور احمد اور دوسرے کا نام نور احمد ہے۔ وہ ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کی ذرا سی تکلیف پہ تڑپ جایا کرتے تھے۔ منظور صاحب میٹرک کے بعد لائل پور کاٹن ملز میں ملازم ہو گئے اور آج کل اسلام آباد میں اپنا ذاتی کاروبار کر رہے ہیں۔ جبکہ نور احمد صاحب زیادہ نہیں پڑھ سکے وہ بھی اپنا ذاتی کاروبار کرتے ہیں۔

عملی زندگی اور اعلیٰ تعلیم

جب میاں بشیر صاحب نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو اعلیٰ تعلیم جو اس خطے میں ہمیشہ سے انگریزوں کے وضع کردہ تعلیمی نظام کے تحت دھن والوں کا ہی کھیل رہی ہے۔ ان کی پہنچ سے باہر تھی۔ تلاش معاش میں اپنی مٹی سے رشتہ چھوٹا اور غم روزگار انہیں لاہور کی نواحی بستی باٹا پور لے آیا۔ انہوں نے باٹا شو کمپنی میں ملازمت کر لی۔ لیکن بے چین روح کی تڑپ ختم نہ ہوئی۔ ان کے اندر کچھ کر گزرنے کا لاوا ابل رہا تھا۔ لیکن دل اور روح کی پیاس بجھانے کے سرچشمے زر کی خاردار باڑھ نے گھیرے ہوئے تھے۔ یہ ملازمت انہوں نے تقریباً سال ڈیڑھ سال کی۔ بعد ازاں فیصل آباد (لائل پور) میں بجلی کے محکمے میں ملازم ہو گئے۔ کیونکہ اس وقت ابھی واپڈا وجود میں نہیں آیا تھا۔ پانی اور بجلی کے الگ الگ محکمے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں انہوں نے اپنی تعلیم کا نئے سلسلے سے آغاز کیا۔ اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل (آنرز ان فارسی) کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں ان کی تبدیلی ساہیوال (منٹگمری) ہو گئی۔ لیکن اب انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا پختہ عزم کر لیا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں میاں جی نے انٹرمیڈیٹ صرف انگریزی کا امتحان پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پاس کیا اور یونیورسٹی کے قواعد کے تحت اگلے سال ۱۹۵۳ء میں انہوں نے صرف انگریزی میں بی اے کا امتحان دے کر ڈگری حاصل کی

۱۹۵۴ء میں صرف فارسی کا امتحان دے کر بی اے میں ایک اضافی مضمون کا امتحان پاس کیا۔

روزگار کو انہوں نے اپنی علمی پیاس کے تابع کر دیا۔ اس طرح انہوں نے ساہیوال سے تبدیلی کر والی اور واپڈا کے بھارت بلڈنگ لاہور کے دفاتر میں آ گئے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ انہوں نے ۱۹۵۶ء میں فارسی ایم۔ اے میں پنجاب یونیورسٹی کے اورئینٹل کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس سے قبل وہ اسی کالج سے سیوکن پرشین میں سرٹیفکیٹ کا کورس مکمل کر چکے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں انہوں نے ایم اے فارسی سیکنڈ ڈویژن میں کیا اور پھر یونیورسٹی کے قواعد کی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۹۵۹ء اردو فائنل میں داخل ہو کر ایم۔ اے اردو سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ اور اسی سال ہی انہیں ایم اے اوایل کی ڈگری بھی حاصل ہوئی۔ اورئینٹل کالج میں اپنے قیام کے دوران ویسے تو انہوں نے اپنے ہر استاد سے بھرپور استفادہ کیا۔ لیکن جناب وزیر الحسن عابدی مرحوم سے تو انہیں عشق تھا اور وہ بھی ان سے

بے حد محبت اور شفقت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں انہوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد باقر اور ڈاکٹر میاں شکور احسن جیسے عظیم المرتبت اساتذہ سے بھی فیض حاصل کیا۔

ایم۔ اے فارسی کے دوران میاں جی شعبہ فارسی کی فارسی سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری بھی رہے ہیں۔ لاہور آکر میاں جی نے کبڈی اور فٹ بال تو زیادہ نہ کھیلے۔ البتہ والی بال میں انہوں نے نہ صرف اورینٹل کالج کی طرف سے شعبہ جاتی ٹورنامنٹ میں نمائندگی کی بلکہ وہ پرائیویٹ طور پر مسلم سپورٹس والی بال کلب کے رجسٹرڈ ممبر اور پنجاب والی بال ایسوسی ایشن سے بھی رجسٹرڈ تھے۔

۱۹۵۹ء میں جب انہوں نے ایم اے اُردو کا امتحان پاس کیا تو وہ اس پر قانع ہو کر نہیں بیٹھ گئے۔ تجسس، تلاش اور جدوجہد کا عمل رکا نہیں۔ اب اُن کے سامنے ڈاکٹریٹ کی منزل تھی۔ چنانچہ وہ حکومتِ ایران کے وظیفے پر اگست ۱۹۶۰ء میں ایران تشریف لے گئے۔ وہاں انہوں نے تہران یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی میں ریسرچ سکالر کی حیثیت سے علمی اور تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ پہلے انہوں نے سرزمین ایران کی صدیوں پرانی زبانوں یعنی اوستہ، پہلوی، پرانی ایرانی فارسی اور موجودہ فارسی میں سرٹیفکیٹ کورس کیے۔ بعد ازاں پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے "فعل مضارع در زبان فارسی" پر بھرپور تحقیق کا آغاز کیا۔ اس تحقیقی منصوبے پر انہوں نے استاد دکتر حسن منوچہر کی راہنمائی میں کام کیا۔ تہران یونیورسٹی میں ان کا تین سال کا عرصہ بھی ایک یادگار ہے۔ وہ وہاں کے غیر ملکی اور ایرانی طالب علموں اور استادوں میں یکساں مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ لوگوں کے دلوں میں اتر کر وہاں اپنے لیے نرم گوشے بنا لینا تو ان کی عادت ثانیہ تھی۔ دکتر منوچہر کے علاوہ تہران یونیورسٹی کے جن اساتذہ سے انہوں نے استفادہ کیا ان میں دکتر ذبیح اللہ صفا، دکتر حسین خطیبی، دکتر محمد معین، دکتر صادق گوہرین، دکتر صادق کیا، دکتر محمد مقدم، دکتر سید حسین نصر، دکتر منصور اور استاذ بدیع الزماں فروزانفر جیسے جلیل القدر صاحب علم و فضل شامل تھے۔ اور ان میں موخر الذکر تو آپ کے تہران یونیورسٹی میں داخلے کے موجب و محرک بھی تھے جو پاکستان میں ایک وفد کے ساتھ آئے اور بشیر صاحب کے ذوق و شوق اور فارسی زبان ادب میں گہری دلچسپی کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے تھے۔

ان تین سالوں میں انہوں نے نہ صرف اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی بلکہ ایران کے کلاسیکی ادب کا بھی بھرپور مطالعہ کیا اور ساتھ ہی جدید فارسی زبان و ادب کا بھی بنظر غائر مطالعہ کیا۔ وہ موجودہ ایرانی لہجے میں اس انداز سے بات کرتے تھے کہ خود ایرانی دانشور بھی حیران رہ جاتے تھے

انہوں نے تہران میں اپنے قیام کے دوران تقریباً پورے ایران کی سیر کی۔ وہ شیراز، اصفہان، تبریز، مشہد، بندر عباس، کرمان، زاہدان کے علاوہ ہر قابل ذکر تاریخی، ثقافتی، مذہبی اور مناظرتی مقام پر گئے۔ شعبہ فارسی کے موجودہ صدر جناب ڈاکٹر محمد اکرم شاہ صاحب بھی ان ایام میں ان کے ہم مکتب تھے۔ وہ بھی اس دور کی ان شیریں یادوں کو نہیں بھلا پائے۔ جو ڈاکٹر بشیر صاحب کی رفاقت میں روشن نقوش کی طرح دل اور ذہن کے پردوں پر ثبت ہو چکی ہیں۔

ستمبر ۱۹۶۳ء میں وہ کامیاب و کامران ہو کر وطن لوٹے۔ اور اکتوبر ۱۹۶۳ء ہی میں وہ پنجاب پبلک سروس کمیشن سے فارسی کے لیکچرر منتخب ہو کر شیخوپورہ گورنمنٹ کالج میں تعینات ہو گئے۔ اس کالج میں وہ اپریل ۱۹۶۴ء تک بی اے کلاسز کو فارسی زبان و ادب کی تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اس مختصر عرصے ہی میں وہ کالج کے اساتذہ اور طلبا کی ایک محبوب شخصیت بن گئے تھے۔ لیکن شاہین کبھی ایک آسمان پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ کسی ایک چوٹی کا ہو کر نہیں بیٹھ رہتا۔ اس کے سامنے وسیع افق پھیلے ہوتے ہیں۔ جنہیں اس نے سر کرنا ہوتا ہے۔ مسلسل پرواز اور بلندیوں کو چھونا اس کا شیوہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر بشیر صاحب بھی خوب سے خوب تر کی تلاش و جستجو میں شیخوپورہ سے لاہور آ گئے۔ ایک تو لاہور جیسے عظیم علمی، ادبی اور ثقافتی مرکز کی کشش دوسرے استاد گرامی جناب وزیر الحسن عابدی کی محبت و صحبت تیسرے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی تحریک یہ وہ عوامل تھے جو انہیں جامعہ پنجاب کے زیر اہتمام قائم شدہ ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان میں بحیثیت ریسرچ آفیسر کھینچ لائے۔ ریسرچ سوسائٹی سے ہی اصل میں انہوں نے اپنی بھرپور علمی، تحقیقی اور ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ اس ادارے میں انہوں نے بے انتہا محنت کی اور اعلیٰ تحقیقی ذوق و شوق کا مظاہرہ کیا، جس کی بنا پر وہ اس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر جناب حمید احمد خاں، جناب ڈاکٹر ایس۔ ایم اکرام اور جناب ڈاکٹر وحید قریشی کے دلوں اور ذہنوں میں گھر کر گئے۔ پروفیسر حمید احمد خاں ان سے بہت پیار اور شفقت رکھتے تھے۔ وہ ان کی شب و روز کی انتھک محنت کے دل و جان سے قائل تھے۔ لیکن میاں بشیر صاحب کے دل اور ذہن کو علمی آسودگی کی وہ دولت نصیب نہیں ہوئی تھی جس کے وہ مدتوں سے متلاشی تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسی مادر علمی سے پھر رشتہ استوار ہو جائے۔ جس کے دامنِ الفت سے انہوں نے علم کے موتی سمیٹے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان موتیوں کی ضو فشانیوں سے

وہ نئی نسل کے اذہان کو منور کردیں۔ جن کو انہوں نے اپنے ذہن کی کٹھالی سے گزار کر مزید روشن اور دلکش کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ مئی ۱۹۶۶ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے شعبہ فارسی میں لیکچرر مقرر ہو گئے۔

اورینٹل کالج میں آکر میاں جی کی زندگی کے شب و روز اور خدوخال میں واضح تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اب انہوں نے تمام تر یکسوئی اور پوری توانائی سے اپنے ذہن میں پرورش پانے والے علمی و تحقیقی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے شبانہ روز کام شروع کر دیا۔ ان کے ان علمی تحقیقی اور ادبی کارناموں کے بارے میں ہم آگے چل کر ایک علیحدہ عنوان کے تحت بات چیت کریں گے۔ لیکن اس جگہ اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ ڈاکٹر بشیر صاحب نے اپنے تحقیقی کام کا آغاز تو دورانِ تعلیم ہی کر دیا تھا۔ جبکہ "تراجم آثار فارسی بزبان اردو" کے عنوان سے ان کا ایک فارسی زبان میں تحریر کردہ مقالہ "ہلال" کراچی میں ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا اور جامعہ پنجاب میں آنے سے قبل وہ فارسی انگریزی اور اُردو میں تقریباً آٹھ کے قریب علمی، تحقیقی مقالے ملک اور بیرونِ ملک کے ممتاز تحقیقی مجلوں میں شائع کروا چکے تھے اور تین کے لگ بھگ ان کی ایسے ہی موضوعات پر مستقل اہمیت کی کتابیں بھی چھپ چکی تھیں۔

ڈاکٹر بشیر حسین صاحب نے اورینٹل کالج کے شعبہ فارسی میں بحیثیت لیکچرر اکتوبر ۱۹۷۲ء تک خدمات سرانجام دیں۔ بعد ازاں وہ اکتوبر ۱۹۷۲ء سے نومبر ۱۹۷۷ء تک اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی فرائض سرانجام دیتے رہے۔ نومبر ۱۹۷۷ء میں وہ ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر ترقی پا گئے اور بالآخر میاں جی اپریل ۱۹۸۲ء میں شعبہ فارسی میں نئی وجود پانے والی مسند حضرت علی ہجویری پر پروفیسر منتخب ہو گئے۔ لیکن ابھی انہوں نے اس مسند کے حوالے سے اپنے نئے علمی اور تحقیقی سفر کا آغاز ہی کیا تھا۔ یعنی ایک سال کا مختصر عرصہ ہی گزرا تھا کہ وہ ایک ایسے اَن دیکھے سفر پہ روانہ ہو گئے۔ جہاں سے کوئی لوٹ کر واپس نہیں آتا۔

اورینٹل کالج میں میاں جی نے بحیثیت استاد تقریباً سترہ سال گزارے۔ وہ اس دوران طالب علموں اور اپنے ساتھی اساتذہ کی ایک محبوب شخصیت رہے۔ وہ ہر ایک سے محبت کرتے تھے اور دوسرے بھی ان سے بے پناہ عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ کالج اور یونیورسٹی کے

اساتذہ میں وہ عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی ذات سے نہ کبھی اپنے ماتحت اور نہ ہی کسی ساتھی استاد کو کبھی کوئی نقصان پہنچا۔ وہ توجدھر جاتے مسکراہٹیں بکھیرتے جاتے تھے۔ صاف دل، صاف ضمیر اور صاف گو شخص تھے۔ محبتیں تقسیم کرنے کا فرض تو گویا انہیں اللہ تعالےٰ کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا۔ اگر کوئی ان سے نفرت و حقارت اور رنجشوں کے خودساختہ سلسلے پیدا بھی کر لیتا تو وہ اپنی مخصوص دل موہ لینے والی مسکراہٹ اور شیریں زبانی سے اس کے دل اور ذہن میں جنم لینے والے نفرتوں اور حقارتوں کے جالے اس طرح صاف کر دیتے کہ وہ شخص اپنی ذات میں شرمندگی کے کئی آئینہ خانے وجود پاتے ہوئے محسوس کرتا۔ ایسے کئی تلخ واقعات پیش آئے۔ اگر کوئی ان کی جگہ دوسرا ہوتا تو معاملہ پتہ نہیں کہاں تک پہنچتا اور کوئی نہ جانے کیا کر گزرتا۔ لیکن میاں جی جیسے شاکر، صابر اور ہر مسئلہ میں خدا کی رحمت کو شاملِ حال سمجھنے والے درویش صفت انسان نے عفو و درگزر کی عظیم مثالیں قائم کیں۔ جنہیں کالج کے بہت سارے اساتذہ بعض طالب علم اور ماتحت عملے کے بہت سارے اراکین اچھی طرح جانتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم ذہنی طور پر سخت محنت، انتھک جدوجہد اور حصول منزل کے پُرعزم ارادوں پر ایمان رکھتے تھے۔ انہوں نے تہذیبی، علمی، ثقافتی، ادبی اور سیاسی مراکز سے دور ایک چھوٹے سے گاؤں کے ناخواندہ، پسماندہ اور غریب خاندان میں آنکھ کھولی تھی۔ لیکن حصول منزل کے لیے عظیم جدوجہد کی۔ وقت کو اپنی گرفت میں لیا۔ اور صورتِ حال سے آنکھیں ملا کر مقابلہ کیا۔ وہ ایک SELF MADE انسان تھے۔ زندگی میں جو کچھ حاصل کیا اس کے لیے کسی مصنوعی سہارے کو بیساکھی کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ وہ سب سے بڑے سہارے یعنی خدا کی رضا کے ہمیشہ متلاشی رہے اور اسی پر اکتفا کیا۔ کہ وہ اس سہارے کو دنیا کے تمام تر سہاروں سے عظیم ترین سمجھتے تھے۔

اورینٹل کالج میں ان کی سترہ سالہ علمی زندگی بڑی بھرپور اور توانا رہی ہے۔ اس دوران انہوں نے بہت سارے اپنے تحقیقی منصوبے مکمل کیے۔ تدریسی فرائض پوری ایمانداری، تندہی اور خوش اسلوبی سے نبھائے۔

انہوں نے ایم اے فارسی کے طالب علموں کو جدید فارسی زبان و ادب کی تدریس بھی دی،

لیکن ان کا اصل موضوع کلاسیکی ادب تھا۔ اس میں انہوں نے نثر اور نظم دونوں کو پڑھایا۔ عظیم صوفی، مبلغ، دانشور، مردِ درویش اور ولی کامل سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخشؒ) کی عظیم علمی، مذہبی اور آفاقی تخلیق "کشف المحجوب" کی تدریس ان کا اصل موضوع اور مضمون رہا ہے۔ اس اعلیٰ و ارفع، روشن و تابندہ کتاب سے جو روشنی میاں جی نے حاصل کی وہ اس سے سترہ سال تک ہزاروں طلبار کے ذہن اور دل منور کرتے رہے۔ اور روحوں کو روشن کرتے رہے۔ یہ اسی کا اعجاز تھا کہ آپ کو مسندِ علی ہجویریؒ کا حقدار گردانا گیا۔

صرف یہی نہیں کہ آپ نے سترہ سال تک ایم۔ اے فارسی کی کلاس پڑھائی ہے بلکہ اس دوران میں آپ نے جو تحقیقی اور علمی ادبی کارنامے سرانجام دئے ان کی فہرست بھی طویل ہے اور معیار بھی اعلیٰ درجے کا ہے۔ ۱۹۶۶ء سے لے کر ۱۹۸۳ء تک فارسی، اُردو اور انگریزی زبانوں میں پچیس کے قریب علمی، تحقیقی، ادبی اور ثقافتی موضوعات پر گرانقدر کتب تحریر کیں اور پچیس کے قریب ملکی اور غیر ملکی اعلیٰ پایہ کے تحقیقی اور علمی ادبی مجلوں میں ان کے بیش قیمت مقالے شائع ہوئے۔ اس مضمون کے آخر میں ان کی کتب اور مقالہ جات کی فہرست قارئین کرام کی نذر کی جائے گی تاکہ وہ خود میاں جی کی علمی بصیرت اور تحقیقی کارناموں سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ علاوہ ازیں بہت سارے طلبار نے ان کی راہنمائی میں ایم۔ اے کی سطح پر تحقیقی مقالے لکھے اور اسی طرح چند علم دوست اصحاب نے ان کی زیرِ نگرانی اپنے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے مکمل کئے۔

شعبہ فارسی کو فعال، متحرک اور جاندار بنانے میں میاں جی نے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا۔ بحیثیت صدر شعبہ بھی اور استاد کے بھی وہ ۸۵ء ۔ ۸۷ء میں شعبہ فارسی کے سربراہ رہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر بھی اہم کارنامے سرانجام دئے۔ اورینٹل کالج کی صد سالہ یادگار تقریبات ہوں یا غالب اور اقبال کانگرس، یوم آزادی کی نسبت سے نمائشِ کتب ہو یا پندرہویں صدی ہجری کے ضمن میں کتابوں کی نمائش یا پھر جامعہ پنجاب کی صد سالہ تقریبات کے حوالے سے یونیورسٹی اساتذہ کی کتب کی نمائش کا اہتمام کرنا ہو۔ انہوں نے ہر موقع پر اپنی اعلیٰ و ارفع انتظامی اور علمی صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔ اور ایسی شاندار اور یادگار تقریبات اور نمائشوں کا انعقاد کیا کہ ہر سطح کے لوگوں نے ان کو بے پناہ داد دی۔ اس کے علاوہ وہ کالج میں منعقد ہونے والی ہر چھوٹی بڑی تقریب میں موجود ہوتے تھے۔

وہ اورئینٹل کالج کی جاری وساری زندگی کے روحِ رواں تھے۔ وہ نہ صرف "اورئینٹل کالج میگزین" اور "مجلۂ تحقیق" کے ادارتی بورڈ میں شامل تھے بلکہ ان دونوں بلند پایہ تحقیقی مجلوں کے پبلشر اور ناشر بھی تھے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس کالج کے جسم سے روح پرواز کر گئی ہو۔ چمن میں ہر سو اداسیوں کا کہرا سا اُگ گیا ہے اور ساعتیں سسکیاں بھرتی گزر رہی ہیں۔ کہ وہ ہستی اور وہ وجود باقی نہیں رہا جس سے محفل کا بھرم قائم تھا۔

عائلی زندگی

میاں جی بشیر حسین کی والدہ محترمہ کا انتقال ۱۹۴۸ء میں ہوگیا تھا۔ بعد ازاں گھریلو ذمے داریاں ان کی پھوپھی صاحبہ نے سنبھال لیں۔ لیکن وہ کافی حد تک ضعیف ہو چکی تھیں اور گھریلو امور کی انجام دہی مشکل امر بن چکی تھی۔ آپ خود ملازمت کے سلسلہ میں باہر رہتے تھے۔ والد صاحب، چھوٹے بھائیوں اور پھوپھی کی مناسب دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ آپ کی خواہش تھی کہ ایسی خاتون ان کی زندگی کی ہمسفر بنے جو ان مشکلات و مصائب میں ان کا ساتھ دے۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں جب آپ کی عمر بیس سال تھی۔ آپ کو ایسی رفیقۂ حیات نصیب ہوگئیں۔ لیکن شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی ان کی بیگم صاحبہ بیمار رہنے لگیں اور بہت جلد ہی یعنی ۱۹۵۸ء میں آپ کو داغِ مفارقت دے گئیں۔ پھر ۱۹۶۰ء میں میاں جی نے اپنی مرحومہ بیوی ہی کی چھوٹی بہن سے عقدِ ثانی کیا۔ جنہیں وہ خود یک و تنہا چھوڑ کر دوسری دنیا کو سدھار گئے ہیں۔ اس عقدِ ثانی کی سب سے بڑی وجہ وہ تین معصوم بچیاں تھیں۔ جو ان کی پہلی بیوی کے بطن سے تھیں۔ انہوں نے سوچا کہ ان کی پرورش و پرداخت بہتر انداز میں اسی طرح ہو سکتی ہے کہ انہیں ممتا کی کمی محسوس نہ ہو۔ چنانچہ ان کے اس دانشمندانہ فیصلے کو وقت نے سچ کر دکھایا اور میاں جی کی موجودہ بیگم صاحبہ نے اپنی تمام تر ممتا ان معصوم بچیوں پر نچھاور کی۔ گو کہ بشیر صاحب کا نکاح ثانی ۱۹۶۰ء میں ہوگیا تھا لیکن وہ اسی سال ڈاکٹریٹ کے لیے ایران تشریف لے گئے۔ اور باقاعدہ رخصتی ان کی واپسی پر یعنی ۱۹۶۳ء میں ہوئی جب وہ شیخوپورہ گورنمنٹ کالج میں لیکچرر تعینات ہوئے۔

میاں جی ایک محبت کرنے والے مثالی شوہر اور شفیق باپ تھے۔ وہ تمام عمر اپنی تمام تر

محبتوں اور چاہتوں کو اپنے گھر کی چار دیواری میں نچھاور کرتے رہے۔ ان کی اور ان کی موجودہ بیگم صاحبہ کی عمروں میں واضح تفاوت تھا۔ آپ تقریباً پندرہ سولہ سال بڑے تھے۔ جب رخصتی ہوئی تو محترمہ میٹرک کی طالبہ تھیں۔ یہ میاں جی کی ذات تھی۔ جس نے نہ صرف انہیں جملہ امورِ خانہ داری کی تربیت دی بلکہ پیر پیر ان کی عملی زندگی کی جانب راہنمائی کی اور اس انداز سے سوچ و فکر کے ارتقا میں حصہ لیا کہ وہ حقیقی معنوں میں رفیقہِ حیات کا منصب حاصل کر گئیں۔ دونوں میں مثالی ذہنی اور دلی ہم آہنگی تھی۔ عملی زندگی کے سفر کی طرف یہ میاں صاحب کا بھی ابھی آغاز تھا۔ وہ نئے نئے تعلیمی میدان میں وارد ہوئے تھے۔ اس لیے نئی نئی منزلوں کی جانب اب سفر میں ان کے ساتھ ایک ہمسفر بھی تھا اور یہیں سے ایک بھرپور اعتماد اور پختہ یقین کی نئی قندیلیں روشن ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ وہ شیخوپورہ سے جب لاہور آئے تو وہ گورنمنٹ کی ملازمت کو خیرباد کہہ کر جامعہ پنجاب کی ریسرچ سوسائٹی میں ریسرچ آفیسر مقرر ہوئے۔ لاہور آکر انہوں نے پہلے راوی روڈ پر رہائش اختیار کی۔ بعد ازاں وہ اسلامیہ پارک میں بھی رہائش پذیر رہے۔ اور پھر انہوں نے اپنے حصے کی گاؤں والی زمین فروخت کر کے سنت نگر آبادی میں محمود روڈ پر موجودہ رہائش گاہ تعمیر کی۔ ۲۰۰۱ محمود روڈ کے چپے چپے پر بشیر صاحب کے پسینے کے نشان ثبت ہیں۔ انہوں نے ایک مزدور اور ایک معمار کی طرح دن رات اپنے ہاتھوں سے کام کیا۔ مرحلہ وار اس کی تعمیر جاری رکھی اور تعمیر ابھی جاری تھی کہ خود دو گز زمین کے ایسے مکان میں جا منتقل ہوئے۔ جس کا کوئی دروازہ نہیں کوئی کھڑکی نہیں اور کوئی روشن دان نہیں۔ ان کے پیچھے اب یہ آشیانہ بڑا اداس ہے۔ محبت اور چاہت کا یہ نگر بڑا سونا سونا لگ رہا ہے۔ کھنکتی آواز اور ترنم آمیز ہنسی کو سننے کے لیے در و دیوار ترس گئے ہیں۔ اب تو ہر سو یادوں کے انمٹ نقش ہی رہ گئے ہیں۔

ان کے ہاں آٹھ بچوں نے جنم لیا۔ پانچ بیٹیاں اور تین بیٹے بڑی تین بچیاں پہلی بیگم کے بطن سے تھیں۔ جن میں سے ایک صاحب زادی (سعیدہ) آپ کی زندگی ہی میں ۸، ۹ اپریل وفات پا گئی تھیں۔ وہ اس وقت دو بچوں کی ماں تھیں۔ آپ نے اپنی ہی طرح اپنی دوسری صاحبزادی بشریٰ کی شادی اپنے معصوم نواسوں کی پرداخت کے لیے اسی جگہ کر دی۔ تیسری بیٹی رخسانہ ہیں۔ موجودہ بیگم سے ان کی دو بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں۔ بڑی بیٹی ثمینہ بی۔ اے کی

طالبہ ہیں۔ ان سے چھوٹے صاحبزادے کا نام محمد اطہر رسول ہے، یہ اب دسویں جماعت کے طالب علم ہیں۔ میاں جی نے اپنے اس بیٹے کو بڑے پیار سے قرآن پاک حفظ کرایا اور وہ اس پر بہت نازاں تھے۔ اس سے چھوٹے بیٹے محمد طاہر رسول نویں جماعت میں پڑھتے ہیں۔ ان سے چھوٹی بیٹی فائزہ بتول ہے جو اب پانچویں جماعت کی طالبہ ہے اور سب سے چھوٹے بیٹے کا نام محمد طیبؒ رسول ہے۔ یہ معصوم آپ کی وفات کے وقت صرف دو سال کا تھا۔ میاں جی کو ویسے تو اپنے تمام بچوں سے انتہائی محبت تھی۔ لیکن وہ طیبؒ کو بے حد پیار کرتے تھے۔ اُسے روح کی گہرائیوں سے چاہتے تھے اور اس کے تمام لاڈ اٹھاتے تھے کہ اللہ نے اس عمر میں انہیں یہ انمول کھلونا عطا کیا تھا جس سے جی بھر کھیلنے کی مہلت نصیب نہ ہوئی۔

میاں بشیر حسین نے نام نہاد سماجی اور مجلسی زندگی سے ہمیشہ پہلوتہی کی۔ ان کی تمام تر کائنات اور سب دلچسپیوں کا گہوارہ ان کا گھر اور وہ عظیم مادرِ علمی تھی جس میں وہ طالب علم بھی رہے اور پھر استاد بھی۔ یا شہر کی مختلف لائبریریاں ان کی آماجگاہ ہوا کرتی تھیں۔ انہوں نے شاذ ہی کبھی باہر کھانا کھایا ہوگا۔ سوائے تقریبات کے کالج میں اگر روز کے معمول سے ذرا بھی دیر ہو جاتی تو پریشان ہو جاتے۔ کہ گھر پہ بچے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ کیونکہ اہل خانہ بھی ان کے انتظار میں بھوکے بیٹھے ہوتے۔ وہ گھر پہ بچوں کے ساتھ بالکل بچے بن جاتے تھے۔ ان کی ہر جائز خواہش انہوں نے ہمیشہ پوری کی۔ بچوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق بھی کرتے تھے۔ ان کے ساتھ اِن ڈور کھیلیں بھی کھیلتے تھے۔ اپنے ساتھ باجماعت نماز کے لیے مسجد میں لے جاتے تھے۔ سب بچے قرآن پاک پڑھے ہوئے ہیں۔ انہیں بہت سی دعائیں، قرآنی سورتیں اور آیات زبانی یاد کروا رکھیں ہیں۔ جس طرح میاں جی خود سادہ زندگی، رہن سہن اور ہر حالت میں سادگی پسند تھے۔ اس طرح اولاد کی تربیت کی۔ نئے زمانے کی جو قباحتیں نئی نسل کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں۔ خدا کے فضل سے ان کی اولاد ان سے محفوظ ہے۔ اس ضمن میں دونوں میاں بیوی کی ذہنی ہم آہنگی نے اہم کردار ادا کیا۔ دونوں نے اپنی اپنی زندگی ایک دوسرے کے تابع کر رکھی تھی۔ اس تیئیس سالہ ازدواجی زندگی میں سوائے معمولی اور لمحاتی رنجش کے کبھی دونوں کے درمیان کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ میاں جی کی زندگی کے شب و روز اور عادات و فضائل

اس نوع کے تھے اور خدا نے طبیعت ایسی عطا کی تھی کہ کون ہوگا جو اُن سے رنجشیں پالتا ہوگا اور یہ تو تھیں ان کی جیون ساتھی۔ دکھ سکھ کی ساجھے دار۔ اگر کبھی کبھار ایسا موقع آ بھی جاتا تو میاں جی خود پہل کر کے منا لیا کرتے تھے اور بات وہیں ختم ہو جاتی۔ ان کے صاحبزادے ابھی لڑکپن میں ہیں۔ میاں جی کے ذہن میں ان کے مستقبل کے بارے میں بڑے زریں اور بھرپور منصوبے تھے۔ وہ انہیں اچھے مسلمان دیکھنا چاہتے تھے جو دین و دنیا دونوں میں عظیم کامرانیاں حاصل کریں۔ یقیناً یہ بچے ڈاکٹر صاحب کی روح کو خوش رکھیں گے۔

غیر ملکی سفر

جیسے کہتے ہیں "سفر وسیلۂ ظفر" ڈاکٹر صاحب قبلہ کا بھی اپنی زندگی کا پہلا سفر اسی نوعیت کا تھا۔ انہوں نے ایم اے فارسی کا امتحان ۱۹۵۸ء اور ایم اے اردو کا امتحان ۱۹۵۹ء میں پاس کیا۔ اسی دوران ایرانی ادیبوں اور دانشوروں کا ایک وفد پاکستان آیا۔ ان میں ایک جہاندیدہ استاد اور محقق جناب بدیع الزماں فروزانفر بھی تھے۔ وہ میاں بشیر حسین صاحب کے علمی و ادبی ذوق اور فارسی زبان و ادب کے بارے میں ان کے بلند پایہ خیالات و احساسات سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ انہوں نے محنت کے اس خوگر کے اندر تحقیقی جوہر کو بھانپ لیا۔ اور ایران واپس جا کر میاں صاحب کو تہران یونیورسٹی میں ریسرچ سکالر کے طور پر رجسٹرڈ کروایا اور حکومتِ ایران سے سکالرشپ منظور کرایا چنانچہ اپنے تحقیقی منصوبے کی تکمیل کے لیے بشیر صاحب اگست ۱۹۶۰ء کو تہران تشریف لے گئے۔ تہران یونیورسٹی میں انہوں نے ستمبر ۱۹۶۳ء یعنی تین سال کا عرصہ گزارا۔ اس دوران میں وہ دوسرے کئی بڑے بڑے ایرانی شہروں، ثقافتی مرکزوں، تعلیمی اداروں، تاریخی و مذہبی مقاموں پر بھی سیر و سیاحت اور تعلیمی سفر پہ گئے۔

میاں جی بشیر حسین کا دوسرا سفر بھارت کا تھا۔ وہ اپریل ۱۹۶۵ء کو دس یوم کے لیے بھارت گئے۔ یہ بھی بعض حوالوں سے تعلیمی سفر تھا۔ اس سفر کے دوران آپ دہلی، آگرہ اور علی گڑھ تشریف لے گئے۔ متعدد علمی، ادبی اور مذہبی شخصیات سے ملے، بزرگوں کے مزاروں پر حاضری دی۔ فارسی زبان و ادب کے اساتذہ سے تبادلۂ خیالات کیا۔ تاریخی، ثقافتی اور

مذہبی مقامات کی سیر کی۔ علاوہ ازیں انہوں نے کئی یونیورسٹیاں اور لائبریریاں بھی دیکھیں۔ اس سفر کے دوران ڈاکٹر محمد اکرم شاہ (موجودہ صدر شعبہ فارسی جامعہ پنجاب) بھی ان کے ہمسفر تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا تیسرا غیر ملکی سفر سب سے اہم اور برکتوں والا سفر تھا۔ اس سفر کی خواہش ہر مسلمان کے دل اور روح میں جذب وکیف کی عجیب کیفیات اور تلاطم برپا کیے رہتی ہے یعنی خدائے بزرگ وبرتر اور اس کے حبیب حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور حاضری کی سعادت حاصل کرنا۔ چنانچہ میاں صاحب کے دل اور روح میں مدتوں پہلے جنم لینے والے جذبوں کی تسکین ستمبر ۱۹۷۹ء میں ہوئی جب وہ ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ سعودی عرب گئے۔ انہوں نے حج بیت اللہ بھی کیا اور روضۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضری کا شرف بھی حاصل کیا۔ ازاں بعد وہ اکتوبر ۱۹۷۹ء ہی میں مذہب اسلام کی اشاعت اور تبلیغ کے لیے مصر بھی تشریف لے گئے اسی دوران انہوں نے سوڈان کا سفر بھی کیا۔ یہ تبلیغی دورہ چار ماہ کا تھا۔ انہوں نے نہ صرف مصر کے بڑے شہروں مثلاً قاہرہ، اسکندریہ وغیرہ میں قیام کیا بلکہ مصر کے دیہات، قصبات اور چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی گھوم پھر کر اللہ اور اس کے نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ پیغام عام لوگوں تک پہنچایا جو آج سے چودہ سو سال پہلے اس زمین پر فلاح، نیکی اور بھلائی کی شکل میں نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے تھے اور جسے ہم نے مادیت کے پتھروں کے نیچے دبا رکھا ہے۔ جس کے احیاء کی ضرورت ہر زمانوں سے اس دور کو زیادہ ہے۔ اس سفر کے دوران انہوں نے عربی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ اور نہ صرف وہ اسے سمجھنے لگے تھے بلکہ اپنا مدعا بھی بیان کر لیتے تھے۔ اس سفر نے میاں جی کی ذاتی اور مذہبی زندگی میں دوررس اثرات مرتب کیے۔ ان کی شخصیت میں حلیمی، بردباری، انکساری، خوش خلقی جیسی صفات جو پہلے بھی موجود تھیں۔ اب اور نکھر کر ظاہر ہو گئی تھیں۔ خدا کی ذات پر اعتماد اور اعتقاد کی پختگی اور ہر قول وفعل میں اس کی رضا کا شامل ہونا ان کی زندگی کا شیوہ بن گیا تھا۔ حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک قول وفعل اور ایک ایک نقش میاں جی کی روح اور دل پر ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بے حد صابر وشاکر بن گئے تھے۔ جب وہ مارچ ۱۹۷۹ء میں واپس پاکستان تشریف لائے تو ان کی ظاہری ہیئت بھی بدل چکی تھی۔ ہنستے ہوئے نورانی چہرے پر اب

روپہلی کرنوں کی مانند سفید شرعی داڑھی عجیب سماں پیدا کر رہی تھی۔

ان کا آخری غیر ملکی سفر بھی بھارت کا تھا۔ دہلی میں ہند و پاک "غالب سیمینار" کا انعقاد دسمبر ۱۹۸۰ء میں ہوا۔ جس میں آپ نے پاکستان کی نمائندگی کی اور اپنا علمی، تحقیقی مقالہ بھی پیش کیا۔ اس کے فوراً بعد علی گڑھ میں "فارسی سیمینار" ہوا تو میاں جی نے اس میں بھی شرکت کی اور وہاں پر بھی ایک پر مغز مقالہ فارسی زبان و ادب کے بارے میں پڑھا۔ وہ جنوری ۱۹۸۱ء کے پہلے ہفتے میں واپس لاہور شریف لے آئے۔

عادات و خصائل

پروفیسر ڈاکٹر محمد بشیر حسین انسانیت کے ماتھے کا جھومر تھے۔ وہ ایک محبت کرنے والے انسان تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا تھا۔ ہر آن مسکراتے رہنا اور لوگوں کی روحوں اور دلوں میں اتر جانا ان کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ ان کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ جو لوگ ان کے لیے خود ساختہ اور نام نہاد رنجشیں اور کدورتیں اپنے اپنے سینوں میں اپنے طور پر پال لیتے تھے۔ میاں صاحب انہیں بھی دعاؤں سے نوازتے تھے اور ان کے ساتھ بھی صاف دل اور کھلے ذہن کے ساتھ ملتے تھے۔ ان کی طرف سے زیادتیوں پر مسکراتے رہنا اور ہر چھوٹی بڑی بات اور تکلیف پر صرف اور صرف خدا کی نصرت طلب کرنا ان کا شیوہ تھا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، سخت محنت بچپن ہی سے ان کا شعار تھا۔ مسلسل جد و جہد اور حصولِ منزل کی خاطر متواتر عمل نے ان کے اندر زبردست قوتِ ارادی کے جوہر بھر دئے تھے اسی کی بدولت نہ تو وہ کبھی احساس کمتری کا شکار ہوئے اور نہ ہی کسی قسم کے منفی احساسِ برتری نے ان کے اندر جنم لیا۔ بلکہ ایک خاص قسم کا صحت مند توازن ان کے ہر قول و فعل کا حصہ بن گیا تھا۔ جس نے ان کی شخصیت کو بھی متوازن بنائے رکھا۔ زندگی کے ابتدائی ایام ہی سے ان کے اندر سخت کوشی اور مشقت نے زبردست قسم کی قوتِ ارادی کو جنم دیا جو تمام عمر حتیٰ کہ موذی مرض الموت کے آخری سطح پر بھی جوں کی توں قائم رہی۔ اسی قوتِ ارادی، خود اعتمادی اور محنت ہی کی بدولت وہ نامساعد حالات و واقعات کے باوجود میٹرک کی سطح سے اٹھ کر ڈاکٹریٹ کرنے کی منزل تک پہنچے اور

وہ جنہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک کاسبی اور کلرک کی حیثیت سے کیا تھا۔ پاکستان کی عظیم یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے تک پہنچے۔ اور اسی کی بدولت انہوں نے اپنے قابلِ صد تحسین تحقیقی اور علمی منصوبے مکمل کئے۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ایسے گھر میں پیدا ہوئے جس میں مذہب سے محبت ضرور تھی۔ ان کی والدہ محترمہ ایک نیک دل، خداترس اور پابند صوم صلوٰۃ خاتون تھی۔ انہوں نے بچپن ہی سے اپنے پیارے بیٹے کے دل اور ذہن میں دینی رجحانات کی پرورش شروع کردی تھی۔ قرآن پاک پڑھایا اور نماز کی تلقین کی۔ چنانچہ میاں صاحب جہاں ایک ہونہار طالب، ایک اچھے کھلاڑی، ایک محنت کش کسان کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ وہاں بچپن ہی سے نماز کی ادائیگی بھی ان کا سب سے بڑا اور اعلیٰ فرض بن گیا تھا۔ جوانی میں یہ عادت پختہ ہوئی اور پھر تو اس ضمن میں خدا نے ان پر اتنے فضل کئے کہ اب تو نماز پنج گانہ باجماعت ادا کرنے کے علاوہ تہجد گزاری اور شب بیداری میں ورد وظیفے ذکر اذکار کے علاوہ روزانہ تلاوتِ قرآن پاک ان کے خون خمیر میں رچ بس گئے تھے۔

وہ صبح گھر سے باوضو ہو کر نکلتے اور ظہر بلکہ بسا اوقات تو عصر اور مغرب بھی اسی وضو سے ادا کر جاتے تھے۔ وہ اکیلے نماز ادا نہیں کرتے تھے کہ چپ چاپ مسجد کو چل دیے۔ کالج میں وہ عموماً ظہر کی نماز پڑھا کرتا تھے۔ اپنے کمرے سے لے کر مسجد کے دروازے تک جو بھی طالب علم، استاد، یا اہل کار ملتا اُسے دعوت نماز ضرور دیتے اور ساتھ لے جانے کے لیے اتنی مسکراہٹیں اور محبتیں اس پر نچھاور کرتے کہ وہ دل وجان سے ان کی تحریک پر جانبِ مسجد چل پڑتا۔ وہ سفر میں ہوں، یا کسی اہم اجلاس میں، بیمار ہوں یا کوئی اور انتہائی ضروری مصروفیت وہ نماز کی ادائیگی کو کبھی نہیں بھولتے تھے۔ نیوسمن آباد کی مسجد کبریٰ کا فرش ان کے ان گنت سجدوں کا امین ہے جب سے انہوں نے شعور کی دنیا میں قدم رکھا تب سے وہ رمضان المبارک کے روزے ضرور رکھتے تھے۔ زمانۂ طالب علمی اور بعد میں کالج اور یونیورسٹی ملازمت کے دوران وہ بڑے خوش لباس لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ داڑھی بھی انہوں نے کہیں ۹۴ء میں اس وقت رکھی جب وہ باقاعدہ تبلیغی جماعت میں شامل ہو کر چار ماہ کا عرصہ خدا کی راہ میں لگا کر واپس آئے تھے۔ اسی زمانے سے انہوں نے

انگریزی لباس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا اور نہایت سادہ لباس سنتِ نبوی کے اتباع میں پہننا شروع کر دیا تھا۔ ٹخنوں سے اونچی شلوار، کھلا کرتہ، سردیوں میں شیروانی اور گرمیوں میں واسکٹ پہنتے تھے۔ کئی دفعہ میں نے خود ان کے لباس کو پیوند لگے دیکھے۔ وہ ہمیشہ ایک جوتا خریدتے اور جب وہ ٹوٹنے کے قریب آتا تو دوسرا خریدتے اور پہلے کو گھر پر پہننا شروع کر دیتے تھے۔ سفید لباس زیادہ پسند کرتے۔ ویسے فاختائی رنگ بھی انہیں بہت پسند تھا۔

میاں جی بشیر حسین نے شروع ہی سے بڑی سادہ زندگی بسر کی۔ وہ بیرونِ ملک بھی تین سال تک رہے۔ ملک میں بھی لاہور جیسے شہر میں عمر عزیز کا ایک لمبا عرصہ گزارا۔ لیکن ان کی دیہاتی بود و باش، وضع قطع، خوراک، بول چال، غرضیکہ ان کی طرزِ حیات کا کوئی بھی انداز نام نہاد نئے دور کی نئی اقدار سے متاثر نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ انہیں اپنی ذات، اپنے تشخص، اپنی حمیت اور اپنے علم پر اتنا بھروسہ اور اعتماد تھا کہ مصنوعی روشنی کی مصنوعی کرنیں ان کے دل اور ذہن کی آنکھوں کو خیرہ نہ کر سکیں۔ وہ ایک مردِ درویش تھے۔ پر وقار شخصیت کے مالک، حیات اور کار و بارِ حیات میں اپنا دامن پاک و صاف رکھتے ہوئے ہمیشہ حقیقتوں کے متلاشی۔ وہ عالم باعمل تھے لیکن خشک زاہد نہیں تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے لاہور کی سماجی اور مجلسی زندگی کے ان اداروں میں شرکت نہیں کی جو اپنے زعم میں تہذیب و تربیت کے مرکز ہیں۔ مثلاً ان چائے خانوں یا کافی ہاؤسوں میں نہیں گئے اور ان ادبی محفلوں میں شرکت نہیں کی۔ جن کے پاس دانشوری تقسیم کرنے کے ٹھیکے ہیں۔ اسی طرح ان کا حلقہ احباب بھی بہت زیادہ وسیع نہیں تھا۔ لیکن ان کی دوستیاں صاحبانِ علم و مذہب سے تھیں۔ جن کے وہ قریب ہو جاتے تھے اسے معلوم ہو جاتا تھا کہ اس شخص میں کتنی بلند ذوقی، اعلیٰ اور شستہ ظرافت کے جوہر، دلآویز تبسم، پر ترنم قہقہے، احباب کی ناز برداریاں سہنے کے جذبے، ان کی خفگیاں برداشت کرنے کے حوصلے، ان کے معمولی سے معمولی کام کو اپنی ذات کا مسئلہ بنا لینے کے انداز موجود ہیں۔ وہ یاروں کے کھرے اور پکے یار تھے۔

خوراک ہمیشہ سادہ کھاتے تھے۔ وہ چٹپٹی اور مرغن خوراک سے پرہیز کرتے تھے۔ انہوں نے سالن کبھی خشک یا بھنا پسند نہیں کیا۔ ہمیشہ اس میں کافی مقدار میں پانی ڈلواتے تھے۔ خربوزہ تربوز، کھجور، گنا، کھیرا، بھنڈیاں، نمکین لسی، دہی وغیرہ بہت پسند فرماتے تھے۔ ویسے انہیں

جو مل جاتا تھا کھا لیتے تھے۔ کھانے میں نقص کبھی نہیں نکالتے تھے۔ پھلوں میں مالٹا، کنوں انہیں بے حد پسند تھا، مٹھائیاں زیادہ رغبت سے نہیں کھاتے تھے۔ البتہ فالودہ پسند فرماتے تھے۔ کھانا گھر پر سب کے ساتھ فرش پر دسترخوان بچھا کر کھاتے تھے۔ سالن کی پلیٹ کو اس طرح صاف کر دیتے تھے کہ دھونے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ روٹی کیسی بھی ہو وہ تمام کی تمام کھاتے تھے۔ اس کے بعض ٹکڑے کچے یا جلے سمجھ کر الگ نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ کسی دوسرے شہر میں کسی کے گھر مہمان جاتے تو وقت کا ضرور خیال رکھتے تھے۔ اگر کھانے کا وقت نہیں ہوتا تو راستے ہی میں بس یا ریل سے اتر کر کسی ہوٹل سے کھا کر اس کے گھر جاتے تھے۔ اس ضمن میں وہ بے جا تکلفات اور رکھ رکھاؤ کے قائل نہیں تھے۔ اسی طرح وہ راستے میں کھڑے ہو کر یا کسی چیز کو براہ راست دانتوں سے کاٹ کر کھانے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ چیز اگر پسند آجائے تو خرید کر گھر جا کر سب کے ساتھ مل کر کھانے میں فرحت محسوس کرتے تھے۔ کھانے میں وہ ایک ہی برتن کے قائل تھے۔ اسی میں تین چار افراد اکٹھا کھاتے تھے۔ کالج میں کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ کوئی پارٹی یا کوئی تقریب ہوتی تو وہ جونیئر سٹاف کے ساتھ مل کر کھانے میں فخر محسوس کیا کرتے تھے۔ اسی طرح اگر وہ کسی کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دیتے تو بھی وہ تکلفات کو درمیان میں نہیں لاتے تھے۔ عموماً کہا کرتے تھے "چلو گھر چلتے ہیں جو دال پانی پکا ہو گا مل کر کھا لیں گے۔" اور ان کی اس پر خلوص دعوت میں من و سلوا کے ذائقے پوشیدہ ہوا کرتے تھے۔

میاں جی بشیر حسین ایک ہمدرد، خدا ترس اور رحم دل انسان تھے۔ ان کی شخصیت میں اتنی جاذبیت اور کردار میں اتنی شان تھی کہ راہ چلتے لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ میں ایسے بہت سے اصحاب کو جانتا ہوں جن کے ساتھ ان کی ایک آدھ ملاقات ہوئی۔ لیکن وہ اس طرح ان کی شخصیت کی جمال آفرینیوں اور شگفتہ بیانیوں کے سحر میں گرفتار ہوئے جیسے وہ صدیوں سے انہیں جانتے ہوں۔ وہ جب اجنبی سے اجنبی شخص کو بھی ملتے اور طرز تخاطب اس طرح کا ہوتا کہ ملنے اور سننے والا مسکراہٹیں اپنے لبوں پہ سجائے ان کی جانب سو دل و جان سے متوجہ ہو جاتا۔ لوگوں کو عمروں کے لحاظ سے مخاطب کرنے کے ان کے انداز بڑے دلکش ہوتے تھے۔ مثلاً "برخوردار"۔ "بابا لوگو" "اللہ کے ولی"، "سوہنیا"، "جان"، یا "میری جان" وغیرہ القابات کے ساتھ خطاب کیا کرتے تھے

گھر آنے والے کو موسم گرما میں سب سے پہلے ٹھنڈے پانی کا گلاس ضرور پیش کرتے۔ دوستوں مہمانوں کو اپنے گھر کے صدر دروازے تک الوداع کہنے آیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر بشیر حسین صاحب کی طبیعت میں ایک قدرتی قسم کی تیزی اور پھرتی تھی۔ وہ آج کا کام آج ہی کرنے کے عادی تھے۔ چاہے اس کی افادیت چھ ماہ بعد ظاہر ہوتی ہو۔ اگر وقت ہے تو وہ اسے فوراً کر گزرتے تھے۔ اسی جوہر نے ان کے تحقیقی کارناموں میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ بولنے میں بھی بسا اوقات تیزی دکھاتے تھے اور چلنے پھرنے میں بھی یہی انداز کارفرما تھا۔ بعض اوقات وہ تیزی میں کوئی بات کہہ جاتے جو سمجھ نہ آتی تو اکثر مذاق میں کہتے۔ اسٹیشن پر جاؤ اور کانوں کی صفائی کرواؤ۔ اسی طرح وہ بعض فیصلے بھی اور بعض اہم امور بھی جلدی میں طے کر لیتے تھے۔ مشورہ ضرور کرتے کہ اس طرح اللہ میاں برکت ڈالتے ہیں۔ جب کوئی مشورہ ان کے فیصلے بات یا کام کرنے کے انداز کے خلاف ہوتا تو پہلی دفعہ تیزی سے کہنا " نہیں۔ تینوں کیہہ پتہ اے اینویں جھبلیاں مار رہیا ایں۔" لیکن اسی روز تھوڑی دیر بعد یا اگلے روز اولین فرصت میں آکر آگاہ کر دینا۔ کہ تم ٹھیک کہہ رہے تھے لیکن اکثر اوقات ان کی بات درست ثابت ہوتی اور فیصلہ بھی۔ انہیں خرید و فروخت کا تجربہ نہیں تھا۔ وہ جب بھی بازار جاتے کوئی کپڑا، جوتا یا کوئی شے خریدنی ہوتی ضرور کسی کو ساتھ لے جاتے۔ ساتھ والے کی پسند کو ترجیح دیتے اسی طرح انہوں نے کہیں بھی کام جانا ہوتا تو ضرور کسی ساتھی کو ساتھ لے جاتے کہ اس طرح جماعت بن جاتی ہے جسے اللہ تعالےٰ پسند فرماتے ہیں۔ ان کی طبیعت کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر قسم کی اعلیٰ سے اعلیٰ آئس کریم کو قلفی اور ہر قسم کے موٹر سائیکل کو سوزکی کہتے تھے۔ کھجوروں کو کھجیاں کہنے میں اور کھیرے کو کھیار کہنے میں بڑی فرحت ہوتی تھی ان کو۔

وہ سبھی سے محبت کرتے تھے۔ ڈاکٹر محمد اکرم صاحب کے ساتھ وہ تین سال تک تہران میں ہم درس رہے تھے۔ اس طرح دونوں کے درمیان دلی اور ذہنی یگانگت موجود تھی جو آخر عمر تک قائم رہی۔ ڈاکٹر آفتاب اصغر کو وہ بہت پیار کرتے تھے۔ ان کو دیکھ میاں جی کے چہرے پر عجیب قسم کا نورانی تبسم رقصاں ہو جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھار اگر آفتاب صاحب کسی مسئلے پر ان سے خفا ہو جاتے اور لمحاتی تلخی بھی پیدا ہو جاتی تو وہ خود جا کر انہیں منایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر آفتاب بھی ان سے بے حد محبت کرتے تھے پیشہ وارانہ رفاقت ابدی چاہتوں میں بدل گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے

اپنے اپنے دل ایک دوسرے کے آگے کھول دیتے تھے اور پھر ذہنی آسودگی، دلی موافقت اور روحانی مسرت کی سرشاری کیفیات کو مقدر بنا لیا کرتے تھے۔ اسی طرح میاں جی بشیر صاحب محترمہ ڈاکٹر نسرین اختر صاحبہ کی بھی بے حد عزت کرتے تھے اور انہیں بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ وہ ڈاکٹر صاحبہ کو اپنی بہنوں کی طرح چاہتے تھے اور ان کے کسی کام آکر دلی طور پر خوش ہوتے تھے۔ شعبہ فارسی کے علاوہ ویسے تو وہ کالج کے تمام موجودہ رفیقانِ کار سے دلی لگاؤ رکھتے تھے۔ لیکن شعبہ اردو میں سے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی اصول پسندی، جرائت رندانہ، صداقت اور علمی بصیرت کے دل و جان سے قدردان تھے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی ذہانت، جرائت اور بیباکی کی ہمیشہ انہوں نے تعریف کی۔ وہ خواجہ صاحب سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اور انہیں جامعہ پنجاب کا نہایت قیمتی اثاثہ سمجھتے تھے۔ شعبہ عربی میں سے ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک کی علمیت اور شگفتہ مزاجی کے گرویدہ تھے۔ ڈاکٹر ظہور اظہر صاحب کی عربی زبان و ادب پر بے پناہ دسترس کے بے حد قائل تھے۔ مولانا کبیر احمد مظہر کے مذہبی علوم بارے مستند اور جامع مطالعے کی قدر کرتے تھے۔ شعبہ پنجابی میں سے جناب حفیظ تائب کے وہ پرانے رفیق کار رہے ہیں۔ جب یہ دونوں ہستیاں واپڈا کے ایک ہی دفتر میں ملازم تھیں۔ حفیظ صاحب کو وہ اکثر "مولانا" کہتے تھے۔ اور ان کی بہت ہی زیادہ عزت کرتے تھے۔ وہ حفیظ صاحب کو عظیم نعت گو شاعر سمجھتے تھے اور ان کی شرافت و متانت کی دل سے قدر کرتے تھے۔ شعبہ اردو کے ڈاکٹر سہیل احمد خاں کی سنجیدگی اور محنت کو انہوں نے ہمیشہ خراج پیش کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سہیل احمد خاں اور شعبہ عربی کے سید مظہر معین مستقبل میں اس کالج کا سرمایہ افتخار ثابت ہوں گے۔ کالج کے باہر اقبال صلاح الدین کے ساتھ عابدی مرحوم کی شاگردی کی مشترکہ قدر باہمی اعتماد اور دلی یگانگت میں بدل گئی تھی۔ اور جہاں تک مجھ ناچیز کا تعلق ہے تو انہوں نے میرے دل، ذہن، روح اور شعور میں موجزن اندھے مد و جزر اور تلاطم خیز لہروں کو ٹھہراؤ، سکون، آسودگی اور اعتماد کی دولت بخش کر زندگی کے مفہوم سے آشنا کر دیا تھا اور میری کیفیت تو کچھ اس طرح تھی۔

کچھ اس طرح میں ترے حلقہ اثر میں تھا
مرے لیے تو بس اک تو ہی شہر بھر میں تھا

اِن سے ملنے کے بعد جو دل کی حالت ہو گئی تھی اُسے کسی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے۔ ۔

تو ملا تو لاتعلق ہو گئے ماحول سے
تیری خواہش نے ہراک شے کو پرایا کر دیا

اور اب ان کے بچھڑ جانے کے بعد دل اور روح میں لہلہاتی پیار و وفا کی تمام فصلیں اجڑ گئی ہیں فراق کی جلتی رو ہی ہر سو پھیل گئی ہے۔ دکھوں اور دردوں کے سورج سوا نیزے پر آکر اپنی تمام آنکھیں کھول کر تپش برسا رہے ہیں۔ اب تو صرف یادیں رہ گئی ہیں۔ بس یادیں جو ہر آن سوچ کی لہروں کے ساتھ مل کر دل اور ذہن میں فرقتوں کے بے شمار سلسلے پیدا کرتی رہتی ہیں اور یہ ایسی منزل ہے جہاں صرف اور صرف اپنے خون سے اپنی روح کو نہلانا پڑتا ہے۔

ہمیں تھے آبلہ پا ہم ہی خاک پیما تھے
ترے فراق کی سب منزلوں میں تنہا تھے

بیماری وفات

ڈاکٹر محمد بشیر حسین کی تمام زندگی جدوجہد میں گزری۔ انہوں نے عمر بھر محنت کو اپنا شعار بنائے رکھا اور وہ کٹھن کٹھن حالات سے گزرے۔ ان عوامل کے اثرات ان کی صحت پر منفی نہیں بلکہ خوشگوار پڑے تھے۔ وہ اکہرے جسم کے مضبوط انسان تھے۔ درمیانہ قد اور پختہ و توانا اعضاء کے مالک تھے۔ وہ چھوٹی موٹی بیماری کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ لیکن گذشتہ ایک سال سے ان کی قوتِ ہاضمہ میں لمبا اوقات معمولی اور بعض اوقات ذرا زیادہ خرابی پیدا ہونے لگی تھی۔ ۱۹۸۲ء کے موسم گرما میں انہیں شدید بخار نے کافی دن پریشان کئے رکھا۔ لیکن اس کے بعد ان کی صحت پھر قابلِ رشک ہو گئی تھی۔ لیکن ۱۹۸۳ء کے آغاز ہی سے ان کے پیٹ کے نظام میں پھر خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ ۱۹۸۲ء کے موسم گرما میں انہیں شدید بخار نے کافی دن پریشان کئے رکھا۔ لیکن اس کے بعد گئی تھی، اور پیچش رہنے لگی تھی اور کبھی کبھار تھکاوٹ کا احساس ہونے پر مضمحل سے ہو جایا کرتے تھے۔ ان کی زندگی کا لاہور سے باہر آخری سفر فیصل آباد کا تھا۔ مجھے اس سفر میں ان کا ہمسفر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس سفر کے دوران انہیں فیصل آباد سے آگے کچھ پیدل چل کر جانا پڑا۔ واپسی پر مجھے آکر بتایا کہ بہت زیادہ تھکاوٹ ہو گئی ہے۔ میں کبھی اتنے معمولی پیدل سفر کو خاطر میں نہیں لایا کرتا تھا۔

اپریل ۱۹۸۳ء کے پہلے ہفتے میں یونیورسٹی موسم بہار کی تعطیلات کی بنا پر بند ہوگئی تو اس دوران وہ بیمار پڑھ گئے۔ بخار اترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس پر ان کے بھائیوں سے بڑھ کر ہمسائے اور صاحب درد انسان جناب افتخار صاحب جوان کی طبیعت کی خرابی بیماری کی وجہ سے بے پریشان تھے۔ اور میاں جی کو بڑے بھائی جتنا پیار کرتے تھے۔ وہ بے چین رہنے لگے۔ آخرکار انہوں نے مجبور کر کے ڈاکٹر صاحب کے مختلف لیبارٹری ٹیسٹ کروائے۔ سب کچھ نارمل تھا۔ سب خوش تھے کہ اچانک دس اپریل کو خون کے آخری ٹیسٹ میں سے ایک ایسے مریض کی نشان دہی ہوئی جسے سن کر ہی انسانی روح کانپ جاتی ہے۔ وہ تھا خون کا سرطان۔ میاں جی نے اسے نہایت تحمل سے سنا۔ اہلِ خانہ اور احباب کو اس انداز سے بتایا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو مجھے اسی دن کالج کے صدر دروازے کے پاس برگد کے درخت نیچے کار کو موڑتے ہوئے کہا "تینوں پتہ اے خون وچوں کیہہ نکلیا اے؟ پھر خود ہی کہنے لگے ڈاکٹر کہندے نیں تینوں "بلڈ کینسر اے" میرے منہ سے اچانک اور تو کچھ نہ نکل سکا۔ صرف انگریزی کا یہ جملہ جیسے اتھاہ گہرائیوں سے نکلا ہو کہ NO. OH. آپ نے پُر زندگی سے بھری ہوئی مُسکراہٹ اور کھنکتے لہجے کے ساتھ کہا۔ YES. OH مجھے ایسے محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے میرے جسم، دل، روح، اور ذہن کی تمام طاقتیں سلب ہوگئی ہوں۔ میں چپ کر گیا اور لگاتار دل سے آہیں سی نکلنے لگیں تو میری ہمت بندھائی۔ مجھے گھر چھوڑ کر اور وہاں بیٹھ کر حوصلہ دے کر واپس آئے۔

اس طرح مٹی کا وہ چراغ جو ۵۰ سال قبل لائل پور (فیصل آباد) کے دور دراز کے کچے گاؤں کے کچے گھر میں روشن ہوا تھا۔ ساری عمر تند خو طوفانوں اور ناموافق ہواؤں میں اپنی لو کو برقرار رکھے ہوئے تھا۔ مسلسل محنت اور پُر کٹھن جد و جہد کے ثمر اس کے نصیب بننے لگے تھے کہ اپریل ۱۹۸۳ء کی دس تاریخ کو ایک سیاہ آندھی نے اس چراغ کی لو کو ڈانواں ڈول کر کے رکھ دیا۔ تیز و تند ہواؤں اور غیر موافق رتوں میں اس کی چمک میں فرق نہ آیا۔ زندگی بھر کی طویل اور بلند و بالا ہمت اب بھی قائم تھی۔ لیکن دیا تو دیا ہی ہوتا ہے وہ کب تک تیز ہواؤں اور قیامت کے طوفانوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ چراغ تیل سے جلتا ہے اور تیل ہی ختم ہو جائے تو بتی تو بہت جلد جل جاتی ہے موذی مرض کا علاج شروع ہوا، ڈاکٹروں نے کہا کہ بیماری ختم نہیں ہو سکتی۔ کنٹرول ہو جائے گی۔ ایک ماہ

کے علاج کے بعد صورتِ حال سنبھلنے لگی تھی۔ ہمت اور جذبے توانا ہوں اور اعتماد و اعتقاد میں پختگی ہو تو مصائب میں اُلجھ کر بھی انسان مسکرا سکتا ہے۔ وہ ایسا ہی کر رہے تھے۔ روزانہ کالج آتے کلاسیں لیتے، دوستوں کی دعائیں حاصل کرتے اور طلبا کے معصوم جذبوں کی برکتیں حاصل کرتے۔ بیماری کے جراثیم ایک صحت مند انسان کے جسم میں موجود جراثیم کی سطح تک آگئے تھے۔ اس دوران میاں جی نے مسجد میں جا کر نمازِ پنجگانہ باجماعت ادا کی۔ تبلیغی جماعتوں کی نصرت بھی کی۔ گھر کے چھوٹے بڑے کام بھی کیے۔ لیکن ۱۶ مئی ۱۹۸۲ء کو اچانک چند گھنٹوں کے لیے انہیں بخار نے آلیا۔ اور یہ بخار لگاتار دو ماہ تک رہا۔ دن میں کئی دفعہ اترتا چڑھتا رہا۔ اس سے پریشانیاں اور تفکرات بڑھے۔ ڈاکٹروں کے مشورے سے وہ میو ہسپتال کے البرٹ وکٹر وارڈ میں ڈاکٹر پروفیسر مسعود کی زیرِ نگرانی داخل ہو گئے۔ یہ ۱۲ جون ۱۹۸۲ء کا دن تھا۔ رمضان سے ایک روز قبل ہسپتال میں بھی انہوں نے نماز نہیں چھوڑی۔ ہمت قائم تھی خود اٹھتے، غسلخانہ میں جاتے وضو کرتے اور کھڑے ہو کر جائے نماز پر نماز ادا کرتے۔ بیماری نے ذرا زور پکڑا تو بستر پر نماز ادا کرنے لگ پڑے ہسپتال کے عملے سے پیار و محبت کے ایسے مظاہر کیے کہ میں نے وفات کے روز ان لوگوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے دیکھے۔ ہسپتال میں ان کے ساتھ گذریں صبحوں، شاموں، دوپہروں اور راتوں کے سلسلے بھی بڑے عجیب تھے۔ ان کا ذکر اگر چھڑ گیا تو جذبات میں بہہ نکلوں گا۔ ویسے چمن لٹنے کی یہ روئیداد "کمرہ نمبر ۵۳ میں آخری مکالمہ" کے عنوان سے جناب طارق عزیز کی زیرِ نگرانی شائع ہونے والے ایک نئے جریدے "تلاش" کی پہلی اشاعت میں شائع ہو چکی ہے۔

یہ ۱۲ جولائی ۱۹۸۲ء ہی کی سہ پہر تھی۔ جب ایک طوفانی ریلا آیا اور چراغ کی ٹمٹماتی روشنی کی ایک ایک لہر کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا اور چاروں طرف اندھیروں کے نگر آباد کر گیا۔ دلوں کی روشن دنیا میں جلتے چراغ بجھ گئے۔ اب انہیں ہم سے بچھڑے ہوئے ایک سال ہونے کو آیا ہے تو لگتا ہے جیسے صدیاں بیت گئی ہیں۔ اور وہ مدت جو ان کی صحبت میں گذری تھی یونہی پل دو پل کی بات لگتی ہے اب رتوں اور موسموں کے تغیر بے معنی سے لگتے ہیں اور دنیا کی رونقیں پھیکی پھیکی۔ زندگی گزارنے کے سارے عمل نامکمل سے۔ وہ دکھوں اور دردوں کی سیاہ رات میں روشنی کی وہ پہلی کرن کی مانند تھے یا سخت دھوپ میں بادِ بہاری کا نرم و نازک ٹھنڈا جھونکا۔ اندھیروں اور سخت دوپہروں میں مجھے

تو بے سائباں کر گیا۔ لیکن مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مرتا۔ سانس آنے اور جانے کی حد تک تو زندہ رہنا ہی پڑتا ہے۔ کسی نہ کسی طور زندگی گزر جائے گی۔ لیکن بڑی کٹھن اور اداس گزرے گی ان کی یادوں کے زرد گلاب من کی دھرتی میں کھلتے رہیں گے اور یہی یادیں اب سرمایہ ہیں جن میں فرقت کے موتی بھرتے جائیں گے۔ آنسوؤں کے نگینے ملتے جائیں گے اور دکھوں دردوں کے جواہرات شامل ہوتے جائیں گے۔ وقتِ آخر بھی انہوں نے "خیرائے خیرائے" کی نوید دی تھی۔ مجھے اپنے رب پر پورا بھروسہ ہے۔ اس نے انہیں وہاں بھی خیریں رکھا ہوگا۔ وہ اللہ کے بڑے پیارے تھے اللہ کو پیارے ہو گئے اور اپنے پیچھے اپنے پیاروں کو اللہ ہی کے سہارے چھوڑ گئے ہیں۔ مجھے یاد ہے حسین قاری صاحب نے ان کا جنازہ پڑھایا تھا انہوں نے بھی اور مسجد کبریٰ کے امام صاحب نے بھی ہزاروں کے سامنے کہا تھا کہ "وہ اس عہد کا ولی تھا جو ہم میں سے اٹھ گیا ہے۔" میاں جی خدا حافظ وہی آپ کا حامی و ناصر وہی آپ کے پسماندگان کا۔ وہ آپ کو اپنی پناہ میں رکھے۔ جنت الفردوس میں اونچے مقام سے نوازے۔ اب قیامت کے روز ملاقات ہوگی۔ اللہ کی رحمت سے جو دنیا میں ایک دوسرے کے پیارے ہوتے ہیں وہ وہاں بھی مل جائیں گے۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔ ڈاکٹر صاحب کی وفاتِ حسرت آیات پر ان کے ایک عزیز شاگرد جناب ابرار حسین صاحب نے قطعہ تاریخ وفات تحریر فرمایا تھا۔ وہ درج کیا جا رہا ہے۔

قطعہ تاریخِ وفات

آج ہی مجھ کو ملی ہے یہ خبر
اُٹھ گیا دنیا سے اِک مردِ فقیر

ایسا انسان کر ڈھونڈے نہ ملے
ایسا استاد نہیں جس کی نظیر

عالم ایسا تھا کہ علم اس کی کنیز
پاؤں میں لیکن عمل کی زنجیر

فکر کی جب پئے تاریخِ وفات
ہو گیا ذہن پہ میرے تحریر

ساتھ میں ساٹھ ملا کر کہہ دو
"آہ جنت کو سدھارے ہیں بشیر"

(۶۰ + ۱۳۴۳ھ) (۱۴۰۳ھ)

بیعت

ڈاکٹر محمد بشیر حسین جہاں شریعتِ محمدی پر سختی سے عمل کرتے تھے اور ایک باعمل عالم تھے وہیں وہ طریقت و حقیقت کی منزلوں کے بھی مسافر تھے۔ وہ اکثر ذکر و اذکار کی محافل میں بڑی رغبت سے حاضر ہوا کرتے تھے۔ بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کے مزاروں پر بھی وہ حاضری دینے جاتے تھے۔ بابا فرید شکر گنج ؒ کے مزار پہ پاکپتن حاضر ہوئے اور حضرت سلطان باہوؒ کے دربار پر انہوں نے حاضری دی۔ ملتان میں مدفون بہت سارے بزرگانِ حق کی خانقاہوں پر بھی انہوں نے حاضری بھری۔ ہندوستان میں دو دفعہ کے سفر کے دوران ڈاکٹر صاحب قبلہ خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ، امیر خسروؒ اور ان کے علاوہ بہت سارے اللہ کے نیک بندوں اور راہِ حق کے عظیم رہنماؤں کے مرقدوں پر جا کر فیض و برکات حاصل کیں۔ لاہور میں وہ یوں تو تمام اہلِ حق کے درباروں پر جایا کرتے تھے۔ لیکن سید علی ہجویریؒ (حضرت داتا گنج بخشؒ) سے تو انہیں بے پناہ عقیدت و محبت تھی۔ انہوں نے تقریباً سترہ سال تک خطۂ پنجاب کے اس عظیم روحانی و دینی پیشوا کی عظیم المرتبت تخلیق "کشف المحجوب" ——— ایم۔ اے فارسی کے طلبا کے اذہان کی تہذیب و تربیت کے لیے پڑھائی۔ وہ مسند علی ہجویریؒ کے پروفیسر تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ مسند داتا صاحبؒ کے طفیل مجھے نصیب ہوئی ہے۔ وہ ہفتے میں ایک دو دفعہ داتا صاحب ضروری حاضری دیتے تھے۔ کبھی اکیلے، کبھی کسی ساتھی کے ساتھ اور کبھی کبھار اہلِ خانہ کے ہمراہ۔

بزرگانِ حق سے ان کی عقیدت و چاہت کے سرچشمے ان کے پیر و مرشد کی وساطت سے پھوٹے جن سے وہ باقاعدہ بیعت تھے۔ اور اس ہستی کا نام حضرت سید محمد علاء الدین جیلانی، نقشبندی، مجددی، چشتی، قادری ہے۔ جو دارالسلام لاری اڈہ موضع ہردیو (شیخوپورہ) میں راہِ حق کے مسافروں کو منزلوں کے نشان عطا

کرتے ہیں ۔ اور جن کا سلسلہ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے جا ملتا ہے۔ دار السلام میں ہر ماہ کی پہلی جمعرات کو محفلِ ذکر و اذکار کا اہتمام ہوتا ہے جس میں اکثر ڈاکٹر صاحب بھی حاضر ہوتے رہتے تھے۔ انہیں اپنے مرشد سے بہت زیادہ عقیدت اور محبت تھی۔ میاں جی بیماری کے دوران بھی اپنے ہادی و رہنما کے آستانہ دعالیہ پر گئے اور ایک دن ان کی صحبت میں گزارا۔ اس طرح وہ بیک وقت شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت و معرفت کے سلسلوں اور منزلوں کے مسافر بھی رہے۔

علمی، ادبی، تحقیقی کارنامے

جس طرح ڈاکٹر محمد بشیر حسین نے زندگی کے کٹھن مراحل کو ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور اسے اس انداز سے بسر کیا کہ حق ادا کر دیا۔ اسی طرح علم و ادب کے میدان میں بھی انہوں نے اپنے لیے اس شعبے کا انتخاب کیا جس میں سخت محنت، مستقل مزاجی، اور عالی حوصلگی کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی تحقیق، تدوین اور ترجمہ وغیرہ تحقیقی موضوعات پر مقالے تو انہوں نے زمانہ طالب علمی ہی میں لکھنے شروع کر دیے تھے۔ لیکن مستقل اہمیت کی کتب کا آغاز انہوں نے تہران سے ۱۹۶۲ء میں کیا اور یہ سلسلہ ۱۹۸۳ء یعنی زندگی کے آخری ایام تک بڑے تسلسل اور کامیابی سے جاری و ساری رہا۔ تحقیق میں بھی انہوں نے ایک اعلیٰ درجے کے ببلیوگرافر کے طور پر علمی و ادبی حلقوں میں اپنی پہچان کرائی۔ یوں تو انہوں نے فارسی، اردو اور پنجابی میں شاعری بھی کی۔ لیکن شاعری صرف شوق کی حد تک رہی وہ شہرت کے پیچھے بھاگنے والے نہیں تھے۔ ٹھوس، بنیادی اور ہمیشہ رہنے والا تحقیقی کام خاموشی سے کرتے جاتے تھے۔ جب کبھی اس موضوع پر بات ہوتی کہ فلاں شاعر شہرت کی بلندیوں پہ ہے۔ فلاں ناول نگار، افسانہ نگار یا ڈرامہ نویس لوگوں میں بے حد مقبول ہے۔ آپ کو ٹی ہاؤس، ادبی انجمنوں کے ممبران، اخبار نویس یا ریڈیو، ٹی۔وی والے جانتے نہیں تو وہ مسکرا کر کہتے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میری مرتب کی ہوئی اعلیٰ درجے کی مخطوطات اور کتب خانوں کی فہرستیں دنیا بھر کی حوالہ جاتی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ دنیا بھر کے اعلیٰ تحقیقی حلقوں نے ان کتابوں پر زبردست تحسین پیش کیا ہے۔ میری یہ کتابیں قیامت تک محققوں کے لیے تحقیق و جستجو کے نئے در وا کرتی جائیں گی۔ مضمون جو کہ پہلے ہی طویل ہو چکا ہے اس کی طوالت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم ان کی تصانیف و تالیف پر تفصیلی گفتگو نہیں کریں گے۔ ان کا صرف ایک اجمالی سا خاکہ پیش کریں گے۔

فہرست افعالِ فارسی

(مشمولہ، راہنمای ریشہ فعلہای ایرانی) از دکتر محمد مقدم در زبانِ اوستا و فارسی —

باستان و فارسی۔ گرد آوردہ با پیوستی از فعلہای فارسی۔ دکتر محمد بشیر حسین۔ یہ کتاب ۱۹۶۳ء میں تہران یونیورسٹی میں شائع ہوئی تھی۔

انشای ماہرو

بتصحیح پروفیسر شیخ عبدالرشید شعبہ تاریخ جامعہ پنجاب۔ بنظر ثانی و اہتمام دکتر محمد بشیر حسین اس کتاب کو ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب نے اکتوبر ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ عین الدین عین الملک عبداللہ بن ماہرو۔ گورنر ملتان (متوفی بعد از ۱۳۶۲ء) کے یہ مختلف خطوط ہیں۔ جن میں دراصل اس خطے کی اہم علمی، ثقافتی، سیاسی، جغرافیائی اور تاریخی دستاویز موجود ہیں۔ ۲۴۴ صفحات کی یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ جس کا انگریزی دیباچہ ۴۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

اسرارِ صمدی

تصحیح و مقدمہ پروفیسر محمد شجاع الدین۔ بنظر ثانی و اہتمام دکتر بشیر حسین ۴۸ صفحات کی یہ فارسی زبان میں کتاب ادارہ تحقیقات پاکستان جامعہ پنجاب کے زیر اہتمام دسمبر ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی اس کتاب میں لاہور کے گورنر نواب عبدالصمد خان کے کارناموں کی معاصرانہ روئیداد پیش کی گئی ہے جس سے پنجاب کے اٹھارہویں صدی کے نصف ثانی کے سیاسی حالات اور سماجی صورتِ حال کا واضح طور پر پتہ چلتا ہے۔

فہرست مخطوطات شیرانی (جلد اوّل، دوم و سوم)

ترتیب و تہذیب، ڈاکٹر محمد بشیر حسین۔ جلد اوّل مارچ ۱۹۶۸ء کو چھپی۔ اس کے ۱۹۸ صفحات ہیں۔ دوسری جلد جون ۱۹۶۹ء کو پہلی جلد کے تسلسل میں شائع ہوئی۔ اس کے صفحات ۱۹۸ سے شروع ہو کر ۴۱۱ صفحات تک ہیں اور اس سلسلے کی تیسری جلد جون ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی اور اس کے صفحات ۴۱۲ سے لے کر ۸۳۵ صفحات تک ہیں۔ یہ تینوں جلدیں ان بیش قیمت اور نادر قلمی نسخوں پر مشتمل ہیں۔ جو حافظ محمود خاں شیرانی نے جامعہ پنجاب کی لائبریری کو فراہم کیے۔ ان میں عربی، فارسی

اردو، ترکی، گجراتی، پنجابی، پشتو، مرہٹی زبانوں کے مخطوطے شامل ہیں۔ انہیں ادارہ تحقیقاتِ پاکستان دانش گاہ پنجاب نے شائع کیا۔

چہار باغ (رقعاتِ حکیم ابوالفتح گیلانی)۔ با تصحیح، ڈاکٹر محمد بشیر حسین

اس کتاب میں عہدِ اکبری کی اسلامی تہذیب اور ثقافت کے بے شمار آثار ملتے ہیں۔ ۱۷۴ صفحات کی اس اہم کتاب کو بھی ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب نے جون ۱۹۶۸ء کو شائع کیا۔

مقالاتِ منتخبہ (جلد سوم، چہارم) مرتب، ڈاکٹر محمد بشیر حسین

اورنٹیل کالج میگزین میں شائع ہونے والے اردو اور فارسی کے منتخب مقالات کی فہرست جو ۸۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ جامعہ پنجاب لاہور نے اسے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔

فہارس اورنٹیل کالج میگزین (ضمیمہ اورنٹیل کالج میگزین) باہتمام ڈاکٹر محمد بشیر حسین

اس میں ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۶۷ء تک کے مقالوں کی فہرست، عنوان اور مقالہ نگار کے نام کے حوالے سے درج کی گئی ہے۔ ۱۰۴ صفحات پر مشتمل اس ضمیمے کو بھی جامعہ پنجاب نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔

فارسی کا ایرانی تلفظ ۔ از ڈاکٹر محمد بشیر حسین

۳۲ صفحات کی فارسی زبان میں تحریر کردہ اس کتاب کو اکتوبر ۱۹۷۱ء میں افقِ ادب لاہور نے شائع کیا۔

مقالاتِ استاداں ۔ تدوین و ترتیب۔ ڈاکٹر محمد بشیر حسین

۵۴ صفحات کی یہ کتاب استادانِ دانش کدہ کے مقالات کی تدوین و تہذیب کر کے مرتب کی گئی ہے

یہ کتاب ۱۹۷۱ء میں چھپی۔

سعید خاں ملتانی از ڈاکٹر محمد بشیر حسین

مغلیہ شہنشاہ شاہجہان کے دور کے اس عظیم شاعر کے حالات و آثار پر فارسی زبان میں پر مغز بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی۔

فہرست مخطوطاتِ شفیع ۔ تالیف دکتر محمد بشیر حسین

عظیم محقق، استاد، دانشور پروفیسر محمد شفیع کے کتب خانہ میں محفوظ اردو، فارسی اور پنجابی مخطوطات کی جدید لائبریری سائنس کے اصولوں پہ ایک شاندار فہرست مرتب کی گئی ہے۔ ۶۵۱ صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب کو جامعہ پنجاب کے اشاعتی ادارے نے دسمبر ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔

LETTERS BY JUSTIC KAYANI

EDITED BY DR-BASHIR HASSIAN

مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس اور صاحب طرز ادیب و خطیب اور دانشور جناب ایم۔ آر۔ کیانی کے انگریزی خطوط کی ترتیب و تدوین کر کے عزیز پبلشرز لاہور سے ۱۹۷۴ء میں شائع کرایا۔ یہ کتاب ۱۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

فعل مضارع در زبان فارسی ۔ از دکتر محمد بشیر حسین

یہ ڈاکٹر محمد بشیر حسین کا وہ مقالہ تھا جو انہوں نے تہران یونیورسٹی میں اپنی ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے لیے تحریر کیا تھا۔ ازاں بعد اسے پاکستان میں ۱۹۷۵ء میں اظہار سنز اردو بازار لاہور نے شائع کیا۔ ۳۴۶ صفحات کی یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک اہم تحقیقی دستاویز ہے۔

مکتوباتِ کیانی ترتیب و تدوین ڈاکٹر محمد بشیر حسین

اس کتاب میں بھی پنجاب اور مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس اور

صاحبِ طرز ادیب جناب محمد رستم کیانی کے وہ خطوط شامل ہیں۔ جو انہوں نے اردو اور فارسی میں مختلف سیاسی، سماجی اور مذہبی شخصیات کو تحریر کیے۔ ۴۹ صفحات کی یہ کتاب کتاب خانہ دانشوران کے زیر اہتمام ۱۹۷۶ء کو شائع ہوئی۔

مخزنِ افغانی و تاریخ خانجہانی

(تالیف خواجہ نعمت اللہ ہروی) مترجم ڈاکٹر محمد بشیر حسین

اس کتاب میں جہانگیری عہد کے سیاسی اور سماجی حالات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس ترجمے سے اس عہد کے سیاسی حالات کے بنیادی ذرائع دریافت ہوئے ہیں۔ ۸۰۳ صفحات کی اس ضخیم کتاب کو اگست ۱۹۷۸ء میں مرکزی اردو بورڈ لاہور نے چھاپا۔

مثنویاتِ محمود۔ (از مولانا محمود لاہوری معاصر اکبر شاہ ۹۶۳ھ۔ ۱۰۱۴ھ)

با تصحیح و مقدمہ۔ دکتر محمد بشیر حسین۔

فارسی غزلیات کا یہ مجموعہ ۱۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے ۱۹۷۹ء میں جامعہ پنجاب کے اشاعتی ادارے نے شائع کیا۔

مندرجہ بالا شائع شدہ کتب کے علاوہ ذیل میں ان کتابوں کے نام درج کیے جاتے ہیں جو ان تحقیقی و علمی منصوبوں پر مشتمل ہیں جنہیں انہوں نے سخت محنت کر کے مکمل کر لیا تھا۔ مگر زندگی نے مہلت نہ دی۔ اب سرکاری و نیم سرکاری اشاعتی ادارے اس ضمن میں یہ گرانقدر سرمایہ شائع کر کے محفوظ کر سکتے ہیں۔ "فارسی ادب کے منظوم اردو تراجم" (اردو)۔ "کلیاتِ سعید خاں ملتانی"۔ "فہرست مخطوطاتِ شیرانی جلد چہارم"۔ "اشاریہ فہرست مخطوطات بانکی پور"۔ اور ان کی آخری کاوش جو انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مکمل کی۔ وہ تھی نیشنل سائنس کونسل اسلام آباد کی طرف سے تفویض کردہ کتاب "پرشین سورسز آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی"

ان مستقل اہمیت کی شائع شدہ اور زیرِ طبع کتب کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے پچیس کے قریب اہم تحقیقی ادبی و لسانی موضوعات پر مشتمل مقالات پاکستان اور بیرون پاکستان کے بین الاقوامی سطح کے تحقیقی و ادبی مجلوں میں شائع کروائے۔ یہ مقالے اپنی اہمیت اور افادیت

کے لحاظ سے بلند پایہ تحقیقی کارنامے ہیں۔ جو فارسی، اُردو اور انگریزی زبانوں میں تحریر کیے
گئے ہیں۔

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ زمین پر منصوبے کچھ بنتے ہیں لیکن آسمان پر
فیصلے کچھ اور ہو جاتے ہیں اور آسمانی فیصلے ہی حتمی اور قطعی ہوتے ہیں۔ جن میں انسان کو رتی بھر
دخل حاصل نہیں ہے۔ میاں جی کے ذہن اور دل میں بے شمار منصوبے ایسے تھے۔ جن کو وہ
اپنی تدریسی زندگی اور پھر ریٹائرمنٹ کے بعد مکمل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن تقدیر کو کون ٹال سکتا
ہے۔ کاتبِ تقدیر نے ان کی زندگی ہی اتنی لکھی تھی۔ لیکن وہ اپنی ترپن ۵۳ سالہ زندگی میں بہت
سے کارہائے نمایاں کر گئے ہیں۔ جو ہمارے پاس ان کی یادگاریں ہیں اور یہ نسل در نسل منتقل ہو کے
ان کی عظمت کی داستانیں بن کر روشنی کے اونچے مینار کا روپ دھار لیں گیں۔ جن سے علم و ادب
کے متوالے روشنی لے کر اپنے دلوں اور ذہنوں کو منور کرتے رہیں گے۔ لکھنے کو تو میں یہ داستانِ غم
لکھتا ہی چلا جاؤں۔ پیار و محبت کی امین یہ داستان ہی تو اصل میں اب فسانۂ دل وجان ہے
جو آنے والے موسموں اور چہرہ بدلتی رُتوں میں دہرایا جاتا رہے گا۔ لیکن ڈر ہے یہ لوگ، یہ زمانہ
اور اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ اسے سنتے سنتے غم و اندوہ کی نیندوں میں نہ کھو جائے کہ یہ تو جاگتے
سویروں کی کہانی ہے۔

ڈاکٹر محمد اسلم رانا

اورئنٹیل کالج۔ پنجاب یونیورسٹی

لاہور

۱۷ اپریل ۱۹۸۴ء

کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت آدم
اللہ
کل ما فی الکون وھم او خیال او عکوس فی مرایا او ظلال
خزینہ معرفت
تذکرہ عاشق ربانی شیر یزدانی رحمۃ اللہ
صوفی محمد ابراھیم قصوری
قیمت ۴۵/= روپے
پروگریسو بکس
۴۰-بی اردو بازار لاہور
155

Marfat.com